انسان، اسلام اور
مغربی مکاتبِ فکر

ڈاکٹر علی شریعتیؒ

• ناشر •
ادارہ احیاءِ تراثِ اسلامی کراچی
پاکستان

انسان، اسلام اور مغربی مکاتبِ فکر

ڈاکٹر علی شریعتی

ناشر
ادارۂ احیاءِ تراثِ اسلامی کراچی
پاکستان

انسان، اسلام

اور

مغربی مکاتبِ فکر

از

ڈاکٹر علی شریعتی

ترجمہ

محمد بن علی باوہاب

ناشر

ادارہ احیائے تراث اسلامی۔ کراچی پاکستان

نام کتاب —— انسان اسلام اور مغربی مکاتب فکر

مصنف —— ڈاکٹر علی شریعتی

مترجم —— محمد بن علی باوھاب

باردوم —— ایک ہزار۔ مارچ ۱۹۹۶ء

ناشر —— ادارہ احیائے تراث اسلامی۔ کراچی۔ پاکستان

تہیہ و تنظیم —— احمد گروپ آف سروسز
پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری ڈویژن

طابع —— احمد برادرس پرنٹرز

قیمت —— [redacted]/-

ملنے کا پتہ

احمد بکسیلرز، اسٹاکسٹ و جنرل آرڈر سپلائرز

۱۸/۲۰ فیڈرل 'بی' ایریا۔ کراچی پاکستان

فون: ۶۳۶۴۹۲۴

موضوعات

صفحہ نمبر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ مترجم

ڈاکٹر علی شریعتی کا شمار اواخر بیسویں صدی کے ممتاز مسلم مفکرین میں ہوتا ہے بلکہ نہیں ایرانی انقلاب کا نقیب کہنا چاہیے۔ اپنی فکر انگیزی اور خیالات کی وسعت و گہرائی کے اعتبار سے اور خداداد تنقیدی و منطقی صلاحیت کی بدولت انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس سے نہ صرف ایران کے مغرب زدہ نوجوان طبقہ کے لئے بلکہ عالم اسلام کے سوادِ اعظم کے لئے اسلامی روح تک پہنچنے کی ایک نئی جہت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ دراصل وہ ایک انقلابی مفکر کی حیثیت رکھتے ہیں جو افکار کی نئی راہیں کھولنا اور اسلامی فکر کو اس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے جس کی موجودہ مسلمانوں کی نئی نسل متلاشی ہے اور مغرب کے بڑھتے ہوئے چیلنج کا جسے سامنا ہے آج کی دنیا مغرب کی برق رفتار ٹیکنالوجی اور مغربی علوم کی نت نئی شاخوں کی یلغار کا شکار ہے نیز مغربی تمدن کی چمک دمک اور مغرب کے ملحدانہ اور گمراہ کن ادب کی بھول بھلیوں

میدان گرم ہو چکا ہے ۔ ویسے میں اسلام کو کئی محاذوں پر معرکہ آرائی کرنی ہے ۔ اس مقابلے اور مجادلے میں مسلمانوں کو لیس کرنے کے لئے اقبال کی نظر اور شریعتی کا منطقی استدلال ہی کارگر ہو سکتا ہے ۔

شریعتی نے اقبال سے بدرجہ اتم استفادہ کرتے ہوئے اُن کے کام کو آگے بھی بڑھایا اور ان کی فکر کو انقلابی بھی بنا دیا ۔ فہم قرآن کو ایک نئی جہت عطا کی ، نئے سانچوں میں ڈھالا اور ایک نیا اسلوب و پیرایہ ۔ اپنے تبحر علمی ، وسیع مطالعہ اور تنقیدی قابلیت و ذہانت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب کی مادیت اور مارکسیت کے سیلاب سے عامۃ المسلمین کے بچاؤ کے واضح خطوط نشان زد کر دیئے ۔

شریعتی مسلم نوجوانوں یا من حیث المجموع پوری امت مسلمہ کو جھنجھوڑتا نہیں بلکہ انکی آسودگی کا سامان بہم پہنچاتا ہے ۔ انہیں تعلیم دیتا ہے اور تنقید و استدلال سے کام لینے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ ان میں احساس شکست کی بجائے یقین محکم پیدا ہو خود اعتمادی پیدا ہو اور ولولہ پیدا ہو وہ بتاتا ہے کہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے وہ کسی کے محتاج و دست نگر نہیں ۔ اسکا اصل پیغام یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی روح کو اجاگر کیا جائے اور بادہ و ساغر کی زبان نہیں بلکہ ٹھیٹ علمی زبان اور منطقی استدلال کا استعمال ہی وقت کا صحیح تقاضا ہے ۔ قرآن کے مفہوم کو اس سانچے میں ڈھالنے ہی سے مادیت اور مارکسیت کے عفریت کو زیر کیا جا سکتا ہے ۔

شریعتی کو بھی اقبال کی طرح مشرقی و مغربی علوم پر کامل عبور تھا یہی وجہ ہے کہ وہ مباحث کو نیا آہنگ دینے کے قابل ہوا اور خود بھی اصطلاحات کا ایک معتدبہ ذخیرہ اس نے وضع کر دیا ۔ اس کی مساعی خاص و عام میں پذیرائی پا گئیں ، جلد ہی برگ و بار لانے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نوجوان اہل دانش جو لادینی طرز تعلیم کے فارغ التحصیل تھے اور اسلام سے برگشتہ ہو چکے تھے

کشاں کشاں مجموعہ اسلام کے گرد جمع ہونے لگے۔ شریعتی نے مغرب کی یلغار کے جواب میں اسلام کی فلسفیانہ اور روحانی اساس پر مبنی ایک مربوط اور طاقتور آئیڈیالوجی کے خدوخال نمایاں کر دیئے۔ غرضیکہ وہ ایرانی انقلاب کے معماروں میں سے تھا جس کی صدائے بازگشت اس کی موت کے بعد بھی سنائی دیتی رہی۔

یہی وہ محرکات تھے جن کی بنا پر راقم الحروف کو اس کی زیر نظر کتاب کا (جو دراصل اس کے خطبات پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ متن میں کہیں کہیں خطبات کی جھلک پائی جاتی ہے) ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

یہ ناگزیر ہے کہ چند سطریں خود ترجمہ کے بارے میں بھی ضبط تحریر میں لائی جائیں۔ اولاً تو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کتاب کی فارسی جدید فارسی ہے جو قدیم اور ہمارے ادبی حلقوں کی مانوس فارسی سے مختلف ہے۔ دوسرے یہ کہ شریعتی نے بیشتر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی بجائے انہیں جوں کا توں رکھا ہے اور ان کا بے دریغ استعمال کیا ہے لہٰذا فارسی متن کے علاوہ ان انگریزی اصطلاحات کو بھی اردو میں قابل فہم بنانا تھا۔ البتہ ہم نے شریعتی کی چند مخصوص اصطلاحات کو (فارسی کی نہ کہ انگریزی کی) بجنسہ برقرار رکھا ہے۔ یہ کوئی غیر شعوری نہیں بلکہ بامقصد اور جان بوجھ کر کوشش ہے کیونکہ فارسی اور اردو کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور ہمارے ادب پر فارسی کے گہرے نقش مرتسم ہیں۔ اس کے علاوہ جن اصطلاحات کو برقرار رکھا گیا ہے وہ انتہائی معنویت اور جامعیت کی حامل ہیں۔ مترجم کے خیال میں اردو کے دامن کو مالا مال کرنے کے سلسلہ میں ان کو رواج دینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ان کی افادیت کے پیش نظر ایک مستحسن اقدام سے تعبیر کیا جا سکے گا۔ جب ہم متعدد انگریزی اصطلاحات کو اردو میں رواج دینے کا جواز پیش کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ فارسی کے ساتھ وہی سلوک کیوں نہ روا رکھا جائے

جبکہ عربی و فارسی کی بیشتر قدیم اصطلاحات اردو کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ اس ہیچمدان کے نزدیک ان اصطلاحات میں بھی زبانِ اردو میں رائج ہونے اور بالآخر جذب ہو جانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس طرح اردو کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے میں جذب و قبولیت کا یہ عمل خاطر خواہ حد تک ممد و معاون ثابت ہوگا۔ ہم نے حاشیہ میں ایسی اصطلاحات کا حوالہ دے دیا ہے۔

ترجمہ کی زبان بیشتر سادہ اور عام فہم رکھنے کی ممکن سعی کی گئی ہے البتہ مضمون کی مناسبت اور مفہوم کی وضاحت کا خیال رکھنا ضروری تھا لہذا کہیں کہیں قدرے ادق محسوس ہوگی تاہم گنجلک اور ژولیدہ ہونے پائی ہے اور نہ ہماری زبان کے مزاج سے بے جوڑ اور اَنمل۔ اس کا فیصلہ بہر حال ناظرین ہی کر سکیں گے۔

امید کی جاتی ہے کہ ہند و پاکستان کے علم دوست طبقہ میں شریعتی کی اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا کیونکہ شریعتی کے افکار ان کے اپنے خیالات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور اسی سانچے میں ڈھالنے نیز اس آئینہ میں اسلام کی سچی تصویر دیکھنے اور اس کی اصل روح تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہو سکیں گے۔

میں جناب پروفیسر حسن عسکری کا ان کے فراخدلانہ تعاون کے لئے بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنا عالمانہ مقدمہ شاملِ کتاب کر کے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کر دیا۔

خاکسار

محمد بن علی باوہاب

۴۴ - مے فیلڈ روڈ

موزلے - برمنگھم - ۱۳

۳۱ جولائی سنہ ۱۹۸۲ء

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی فکر کی تاریخ دراصل عالمی مذہبی شعور کی تاریخ بھی ہے۔ اس فکر کا مقصود منتہا حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں جو انسان سے ماورا بھی ہے اور اس کے باطنی وجود کی اساس بھی، ایک مربوط نقطۂ نگاہ تک انسان کی رسائی ہے۔ اس تاریخ کا آغاز نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تنہا ذاتِ اقدس سے ہوتا ہے۔ اسی ذاتِ گرامی کی بدولت ایک نیا تمدن معرضِ وجود میں آتا ہے وہ تمدن جو دورِ ماقبل کے ہر تمدن کے برعکس سارے عالم کو سموئے ہوئے ہے۔ آنحضرتؐ کی تعلیم کا اقتضا یہ ہے کہ اس تمدن کا حیطۂ اثر کسی ایک نسل، زبان یا ثقافت کا پابند نہ ہو بلکہ پوری انسانیت کے نام ہو جائے۔ یہ گویا "جہاں بینی" کا ایک انقلابی تصور ہے کیونکہ اس تصور کی بنیاد اصولِ توحید ہے جو بالآخر تمام تر مسلم فکر پر چھایا رہا۔

خدا کی "احدیت" کا اعلان ہوتے ہی اس عالمِ موجودات اور اپنے خالق کی یکتائی میں رشتہ ہے اس کی بنیاد پر عالم کی کثرت و گوناگونی اور بوقلمونی ایک ایسی وحدتِ فکر کا قالب اختیار کر لیتی ہے جسے اسلام وحدتِ آیات سے تعبیر کرتا ہے اور یہ وحدت محض ان قوانین کی وحدت ہے جن قوانین کے تابع مادی علائق و اشکال اور تغیرات ہیں۔

اصولِ توحید کیساتھ ساتھ قرآن نے ایک نیا تصور یعنی آیات کا تصور دنیا کو دیا۔ قرآن کی رو سے اس عالمِ موجودات کی وحدت اس لئے برقرار ہے کہ وہ ایک ایسی نشانی یا آیت ہے جو اپنے خالق کا پتہ دے رہی ہے۔ یونانی فلسفہ سے یہ بالکلیہ انحراف تھا۔ عالمِ فطرت اب "میدان کارزار" سے کہیں بڑھ کر ایک "عمل اظہار" کی حیثیت اختیار کر گیا۔ گویا فطرت ہی زبان اور کتاب بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مظاہرِ فطرت اور اصل آیات ہر دو کے لئے ایک ہی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ مظاہر فطرت اور کتاب دونوں پر ایک ہی لفظ آیت کے اطلاق میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ مظاہرِ فطرت بھی اہلِ دانش یا "اولی الالباب" کے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح فطرت خود بھی الفاظ کی شکل اختیار کر گئی اور انسانی فکر و تامل اور استغراق کا ایک ذریعہ بن گئی حتیٰ کہ انسان خود بھی اب فطرت کے شعورِ ذات سے عبارت تھا۔ پس فطرت سے اس طرح آگہی کہ ایک نشانی کے طور پر وہ فکر و تامل کا موضوع بن جائے، فی الحقیقت اس وحدت پر غور و فکر کے مصداق تھا جو کثرت بن کر بکھری پڑی ہے اور جب انسان کی شخصیت میں جلوہ گر ہوتی ہے تو انسان خدا کی وحدانیت کا شا اور گواہ بن جاتا ہے۔ پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وحدتِ فطرت جس کا شعورِ ذات وہ خود ہے، در اصل اس ماورائی وحدت کا عکس یا ظل ہے جس کی وہ شہادت دے رہا ہے۔ یہ سارے اسلامی فکر کا اصل ماخذ و سرچشمہ ہے۔ اس بحث کو مزید آگے بڑھانا ممکن نہ ہوگا کیونکہ مابعد الطبیعیات کے بعض انتہائی پیچیدہ مسائل چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ یہاں صرف اس قدر ک دینا کافی ہے کہ اسلام میں آفاقی نقطۂ نگاہ اور جہاں بینی کا جو تصور مضمر ہے انسان اور فطرت دونوں کی ماہیت پر اس سے نئی روشنی پڑتی ہے اور اہلِ بصیرت کے لئے ایک اچھوتا زاویہ فراہم ہوتا ہے۔

جہاں فطرت پر یہ بات صادق آتی ہے وہیں تاریخ پر بھی۔ توحید کا تصور تاریخ کے بارے میں نقطۂ نظر کی یکسر تبدیلی کا متقاضی تھا لہٰذا تاریخ بھی ایک آیت یا نشانی بن گئی۔ نیز حشر و نشر اور معاد کے تصورات کی تاریخ ہو گئی۔ یہ نوع انسان کے ایک مخصوص طبقہ یا گروہ کے لئے نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ آدم اس ازلی امانت کا امین تھا جس کا بار اٹھانے سے فرشتوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ نہ صرف اپنے وجود کے راز یعنی "بشری امانت" بلکہ اس عہد و پیمان یعنی "میثاق" کی بھی جو اس نے اللہ سے کیا تھا۔ اب لوٹ کر اس امانت کو خدا کے حضور میں پیش کر دینا گویا اپنے زمانی اور تاریخی وجود کے پُر خطر اور دشوار گزار نشیب و فراز سے ہو کر گزرنا تھا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" یعنی ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی جانب ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ یہ تھا خدا کی جانب رُخ پھیر دینے یعنی "وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض" کا مفہوم۔ اپنے "داخلی" پہلو میں یہ مقصد "ذکر" کے ذریعہ پورا ہوتا ہے لیکن "خارجی" پہلو کی تکمیل پوری نوع انسانی کی تاریخ کے ہر دور میں مسلسل جدوجہد یعنی "جہاد" کے ذریعہ ہی ممکن ہے گویا نفس پر قابو پانے کی داخلی اور باطنی کوشش کہ اپنی فکر اور قلب و نظر سے حقیقی "اِلٰہ" کے سوا ہر "غیر اللہ" کا خیال محو کر دینے اور معاشرہ یعنی نفس انسانی کے تاریخی محور کو ہر قسم کے باطل معبودوں سے پاک کر دینے کی جدوجہد لاینفک طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہو گئی لہٰذا توحید نفسیاتی اعتبار سے بھی قلب ماہیت ہے اور معاشرتی اعتبار سے بھی۔

علی شریعتی "انسان اور تاریخ" کے اسی توحیدی نقطۂ نگاہ کو پیش کرتا ہے جو اس کے قول کے مطابق مادیت اور مارکسیت کے موجودہ نظریات کے تانے بانے سے براہ راست متصادم ہے مادیت اور مارکسیت دونوں کے دونوں کسی بھی مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نگاہ کو سرے سے رد کر دیتے ہیں۔ ہر دو فرد اور کائنات کے وجود کو ٹھیٹ تجربیت اور مادیت ہی کی کسوٹی پر پرکھتے

ہیں۔ ان میں سے ایک تو انسان کو لاشعور کا اسیر اور دوسرا طبقاتی جبریت کے طوق و سلاسل میں گرفتار خیال کرتا ہے۔ شریعتی اس کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ اسلام اور مارکسیت کے مابین نصب العین حیات کے بعض ظاہری پہلوؤں کی یکسانیت کو غلطی سے اصولوں اور بنیادی مسلمات کی ہم آہنگی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

شریعتی بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ اسلام کو ایک متبادل آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے مسلم ذہن کو قدامت پسندانہ روش سے باز رہتے ہوئے اپنی خود ساختہ چار دیواری سے باہر نکلنا ہوگا۔ نیز اسلامی فلسفہ کو رائج الوقت اور معروف دانش آفاقی کلیات و مسلمات کی اصطلاحوں میں بیان کرنا ہوگا لیکن دعوت اسلام کی تجدید یورپ کے روشنائی دور کی خودستائی میں تبدیل نہ ہو جائے بلکہ مسلمانوں کے موقف اور ہمارے دور میں جن مختلف پیرایوں سے اس کا اظہار ہوتا ہے اس کا سخت تنقیدی انداز اور رد و قدح کے ذریعہ جائزہ لیا جائے۔

چونکہ وہ فرانسیسی عمرانیات کا طالب علم اور اسی ماحول کا تربیت یافتہ تھا، اس نے چاہتا ہے کہ معاشرہ اور تاریخ ہر دو کا ان کی تعمیر و ساخت اور حرکت پذیری کے تعلق سے تجزیہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر بہر حال اپنے دور کی نظریاتی تحلیل و تجزیہ سے غیر وابستہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے یہی افکار و خیالات ایرانی انقلاب کی عمارت کا اہم ستون بن گئے۔

۱۹۷۷ء میں شریعتی کی موت نے ہمیں ایک عظیم ذہن سے محروم کر دیا جو دور حاضر کی اسلامی فکر کی قلب ماہیت کر کے اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا اہل تھا۔ اس کی یہ مختصر لیکن جامع کتاب اس کے بے شمار خطبات اور کتابوں کی طرح اسلام اور موجودہ دور کی تفسیر ہے۔

ہر آئیڈیالوجی کے بنیادی مفروضات و مسلمات کا احاطہ کرتی ہے بالبتہ ہر آئیڈیالوجی کے مخصوص و معین مفروضات کا تشخص کا سے وارہ کا مصداق ہے لیکن اس کے باوجود بڑے باضابطہ اور منظم طریقہ پر اس مہم کو سرانجام دینا شریعتی کا قابلِ تحسین کارنامہ ہے کیونکہ کسی بھی نظامِ فکر کو محض اس کی رسمی اور ظاہری قدروں پر نہیں جانچا جا سکتا بلکہ صحیح طریقہ اس کے اصل مسلمات اور موضوعہ اصولوں پر اس کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ یہیں آکر ایک طرف تو اسلام اور دوسری جانب مارکسیت و مادیت کا بنیادی فرق واضح ہو جاتا ہے۔

اردو زبان میں کسی بھی مغربی آئیڈیالوجی کی باضابطہ اور اصولی تنقید کا فقدان ہی ہے۔ بالخصوص اسلام کے نقطۂ نظر سے اور پھر اسلام کے اپنے حرکی پیرایہ میں، لہٰذا شریعتی کی اس کاوش کا ترجمہ یقیناً اردو داں مسلمانوں کے مذہبی شعور اور نظریاتی افکار کی سطح بلند کرنے میں بڑا ہی ممد ثابت ہوگا۔

اس موقع پر میں اپنے دوست محمد بن علی باوہاب کو اردو زبان میں اس گراں قدر ادبی اضافہ کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ مسٹر باوہاب فارسی اور اردو کی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ موصوف اس سے قبل بھی "افکارِ حاضرہ" کے نام سے پروفیسر جوڈ کی کتاب GUIDE TO MODERN THOUGHT کا ترجمہ کر کے جو مجلس ترقی ادب "لاہور سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکا ہے، ایک کامیاب مترجم ہونے کا ثبوت دے چکے ہیں۔

میری دعا ہے کہ شریعتی کا یہ کارنامہ جو اب زبان اردو میں دستیاب ہے انسان اور تاریخ ہر دو کے تعلق سے ایک سائنٹفک اور تنقیدی مطالعہ کے لئے میدان ہموار کرے — ایسے مطالعہ کے لئے جو براہِ راست ماورائی حقیقت اور تجربی حقیقت دونوں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

سید حسن عسکری
۲ اگست ۱۹۸۲ء

۱۱۰، ونچیسٹر گارڈنس برمنگھم ۲۱

اصالتِ انسان[1]

انسان کی حقیقت کا علم حاصل کرنے کی ضرورت :-

"انسان کیا ہے" اس کی منطقی اور جامع تعریف پر اتفاق رائے دراصل ممکن ہی نہیں کیونکہ ایسی کسی بھی تعریف میں اس حکیمانہ نقطۂ نگاہ، فلسفیانہ مکتب فکر یا مذہبی عقیدہ کی جھلک پائی جائے گی جس کی روشنی میں اسے زیر غور لایا جائے گا۔ اس "عالم اصغر" کے راز سربستہ کی عقدہ کشائی میں اور تو اور سائنس بھی بے بس رہی ہے۔ جیسا کہ الکسز کیرل[2] نے کہا ہے "انسان جس قدر بھی عالم خارج میں کھو گیا اسی قدر اپنے آپ سے دور ہوتا چلا گیا اور اس نے اپنی حقیقت ہی فراموش کر دی۔" یہ محض اتفاق ہی نہیں کہ کیرل جو فرانس میں "انسیات"[3] کے ادارہ کے بانیوں میں سے ہے اور ہمارے عہد کی ایک بلند پایہ شخصیت ہے انسان کو "مجہول" اور "نامعلوم" کہہ کر پکارتا ہے لیکن اس کے باوصف انسان کے بارے میں علم حاصل کرنے کی کوشش سے باز نہیں آنا چاہیے تاکہ اس کی اصلیت اور بنیادی حقیقت کا ایک صحیح تصور قائم ہو سکے۔ انسان کے بارے میں علم کے

---

[1]: یہ اصطلاح خود ڈاکٹر شریعتی کی ہے جس کو بجنسہ قائم رکھا گیا ہے۔ (مترجم)

[2]: ALEXIS CARRAL

[3]: HUMANISM۔ ڈاکٹر شریعتی نے بیشتر مروجہ انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی بجائے ان کا املا تبدیل کرنے پر اکتفا کیا ہے مثلاً اس نے HUMANISM کی جگہ ہیومانزم استعمال کیا ہے اور اسی طرح آگے متعدد اصطلاحات کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ (مترجم)

معنی میں ہمارے اپنے بارے میں علم حاصل کرنا جس کے بغیر ہم خود شناسی کے ایک ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھرے رہتے ہیں کہ سائنس کے چراغ روشن یعنی آگہی کے ذریعہ بھی ہماری رہبری نہیں ہو پاتی۔

اس عدم استطاعت کو ایک المیہ خیال کرنا چاہیئے کیونکہ سائنس کی دنیا میں انسان کی محیر العقول کامیابیوں سے قطع نظر وہ بذاتِ خود زندگی کے صحیح معنی و مفہوم سے نا آشنا ہے گویا خود اپنی ذات اور اپنے وجود کی اہمیت و معنویت سے بے بہرہ سا ہے۔ ڈیوی[1] کی رائے میں اس صورتِ حال سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم کے انسان کے مقابلہ میں آج کا انسان نفس پر حکمرانی کیلئے کمزور و ناتواں بھی ہے اور اپنے آپ پر حکمرانی کا علم بھی کم رکھتا ہے۔

اس لحاظ سے اس نامعلوم، یا مجہول کے متعلق علم حاصل کرنا یعنی انسان کے متعلق علم حاصل کرنا بمقابلہ کسی اور علم کے اشد ضروری ہے۔ یہی رنج حیات کا کلیدی علم ہے۔ ہم عصر سائنسی، عمرانی اور نظریاتی بنیادوں پر بنی نوع انسان کو صحیح معنوں میں آزاد کرنے اور ان میں کم از کم اپنی فلاح و بہبود کا احساس بیدار کرنے کی کوششوں کے ناکام ہونے کا بنیادی سبب بلا مبالغہ اور ٹھیک ٹھیک طور پر یہی ہے کہ ان تمام مساعی اور متعلقہ کامیابیوں کا اصل مرکز و محور یعنی انسان یا تو بدستور نامعلوم ہی رہا ہے یا کسی نہ کسی طرح اس کو فراموش کر دیا گیا ہے۔

یہ کس قدر لا طائل کوشش ہے کہ ہمارے بعض چوٹی کے انجینئر اور آرکیٹکٹ انتہائی مغالطہ آمیز اصولوں کے گھمنڈ میں بہترین اور آرام دہ ترین گھروں کی باتیں کرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ اُس خاندان کے افراد کی سیرت کو سمجھ لیں جسے ان میں فروکش ہونا ہے یعنی یہ کہ ان کی شخصیت کس

---

[1] DEWEY

تعیین کی ہے۔ ان کا نقطۂ نگاہ اور نصب العین کیا ہے اور ان کی بنیادی احتیاجات کیا ہیں وغیرہ۔ موجودہ نظام ہائے تعلیم نے بھی ترقی کی جانب حیرت ناک قدم اٹھائے ہیں جن میں وہ تازہ ترین سائنسی انکشافات شامل ہیں جو نفسیات کے میدان میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور عظیم فنی امکانات اس کے سامنے ہیں لیکن اس کے باوصف نہ صرف یہ کہ اس خصوص میں کوئی درخشندہ کامیابی حاصل ہو سکی (بجز اس کے کہ پوری کی پوری نسل کو سائنٹیفک اور فنی تعلیم کے حصول اور ذہنی نشو و نما کی جدوجہد پر مامور کر دیا گیا ہے۔) بلکہ کئی لحاظ سے یہ مساعی بے ثمر ہی ثابت ہوئیں، خواہ ماضی کے تدریسی نظام اور نظم و ضبط ہی کے طریقوں کو پیش نظر رکھا جائے تب بھی۔

لہٰذا بات یہ ہے کہ موجودہ دور کا انسان، انسان کی تعمیر پر اپنے اسلاف کے مقابلہ میں بہتر طریقے پر قادر تو ہے لیکن ان کی بہ نسبت اس امر سے کم واقف ہے کہ وہ کیا کچھ تعمیر کر رہا ہے جہاں تک اس کی اپنی زندگی کا تعلق ہے وہ جس قسم کی چاہے زندگی بسر کرنے کا اہل ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ "کیسے"؟ اس لئے کہ وہ "کیوں" سے واقف نہیں۔ یہ ہیں وہ بنیادی سوالات جن کا کوئی جواب سرمایہ دارانہ معاشروں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ رہا کمیونسٹ معاشرہ تو اس قسم کے سوال کی جرأت کس میں ہے؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید نظریات، قدیم مذاہب کی جگہ لینے کے لئے انتھک کوشاں ہونے کے باوجود، بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل سے عاجز نظر آتے ہیں اور آخری نوبت پر لوگوں میں یا تو اپنے ہیچ ہونے کا احساس پیدا کرتے ہیں یا انہیں اپنے دام میں جکڑ لیتے ہیں پھر بھی۔ نہ تو مغرب کی لبرل دنیا میں اور نہ مشرق کی کمیونسٹ دنیا میں فلسفۂ حیات انسانی کو کوئی مقام حاصل ہے اس لئے کہ ان مسلمہ حیثیت کے

حال ہر دو معاشروں میں جس چیز کو قربان کر دیا گیا ہے ۔ وہ اساسی طور پر طبیعتِ انسانی کی آزادانہ نشو و نما ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کریں ہمیں چاہیے کہ انسان کی اساسی فطرت کا مفہوم معلوم کریں بعد ازاں ہم اس کی آزادانہ نشو و نما کے مسئلہ پر بحث کر سکیں گے ۔ نیز اس کے تغیر و تبدل اور اس کی انسداد و انحطاط پہ ۔

لہذا ہم اس ضرورت کی طرف مراجعت کرتے ہیں کہ انسان کی بنیادی حقیقت اور اس کے جوہر اصلی کو متعین کریں کیونکہ " انسان " ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہر قسم کے طرز زندگی اور ہر مکتب فکر کی قدر و قیمت یا عدم افادیت کو پرکھا جا سکے ۔

اصالت انسان

حیات انسانی کے بارے میں سائنس کے سارے ابہام کے باوجود اور اس واقعہ کے باوصف کہ ہر ایک فلسفیانہ مکتب فکر اور ہر ایک مذہب اسکی توجیہہ و تشریح اپنے اپنے انداز سے کرتا ہے۔ چند ایسے مبادیات اور بہت ہی اہم مشترک اصولوں پر اتفاق رائے ممکن ہے جنکی بنیاد پر تمام فکری مذہبی اور معاشرتی مکاتب فکر انسان کے بارے میں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔

مجموعی طور پر طے شدہ ان مسلمات کے مجموعہ کو وسیع تر معنوں میں "انسیات" کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ایسا مکتب خیال کہ انسان کی آزادی اور کاملیت جس کا بنیادی نصب العین ہو اور انسان کی ہستی کو اولیت کا درجہ عطا کرتا ہو اور جس کے اصول ان بنیادی احتیاجات کا جواب فراہم کرنے پر مبنی ہوں جن سے انسان کی بشریت عبارت ہے۔ بحالت موجودہ ایسے چار فکری دھارے ہمارے سامنے ہیں جو باہم متضاد نوعیت کے حامل ہونے کے باوجود "انسیات" کی نمائندگی کے دعویدار ہیں۔

۱۔ مغربی لبرل مکتب ۲۔ مارکسیت ۳۔ وجودیت اور ۴۔ مذہب

مغربی لبرل مکتب تو اپنے آپ کو تاریخی لبرل مکتب کی ثقافت اور فلسفہ ہی کا اصل

وارث تصور کرتا ہے جس کے دھارے گویا اسی سرچشمہ سے بہتے ہیں جو قدیم یونان کی فکر اور ثقافت کا ایک تسلسل ہے اور موجودہ دور کے یورپ میں نسبتاً اوج کمال کو پہنچ چکا ہے۔ مغربی فلسفہ 'انسانیات' کی بنیادیں اس صنمیاتی ماحول پر استوار ہیں جو قدیم یونان کے ساتھ مختص رہا ہے جہاں ارض وسماء (یعنی دیوتاؤں کی دنیا اور آدمیوں کی دنیا) کے مابین ایک مسابقت اور مخالفت حتیٰ کہ ایک قسم کا حسد و رقابت موجود ہو نیز یہ خدا بحیثیت انسان دشمن طاقتوں کے ہر آئینہ اس کے درپے رہتے ہوں کہ بنی نوع انسان پر جبر و تشدد کے ذریعہ اپنا تسلط برقرار رکھیں اور انہیں خود آگہی، آزادی و خود مختاری کے حصول اور تسخیر فطرت کی جدوجہد سے باز رکھیں۔ پھر یہ کہ کوئی بشر ان راہوں پر قدم رکھتا ہے تو وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور آنے والی دنیا میں انتہائی المناک عذاب اور سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔ انسانیت گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقلاً اسی قید سے چھٹکارا پانے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔ وہ الوہی طاقتوں کے حصول کے ذریعہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی فکر میں رہتی ہے تاکہ اپنی تقدیر کو خداؤں کی قدرت کاملہ کے قبضہ سے رہا کرالے اور بالآخر اپنے اختیار و ارادہ کی دسترس میں لے آئے۔

اس میں شک نہیں کہ بنی نوع انسان اور خداؤں کے درمیان اس قسم کی رقابت ہر لحاظ سے عین فطری بات تھی اور یونانی دیومالا کا منطقی حاصل بلکہ ایک نقطہ نظر سے جائز حتیٰ کہ ترقی پسندانہ بھی، کیونکہ ان صنمیاتی قصوں میں خداؤں کی حیثیت فطرت کی مادی طاقتوں کے مظاہر اور ارباب انواع[1] یعنی ان مظاہر کے اولین نمونوں کی تھی مثلاً دریا، سمندر، زمین، بارش، حسن اور خوبصورتی، جسمانی طاقت، معاشی مرفہ الحالی، موسم، طوفان، زلزلے، بیماری، قحط،

---

[1] یہ اصطلاح یعنی "ارباب انواع" علی شریعتی نے قوائے مادی کے مظاہر فطرت (ARECHETYPES) کیلئے استعمال کی ہے جس کو ترجمہ میں بھی برقرار رکھا گیا ہے (مترجم)

اور موت وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح خداؤں اور انسانوں کی جنگ فی الحقیقت ان فطری طاقتوں کے غلبہ کے خلاف انسانیت کی جنگ ہے جو بنی نوع انسان کی زندگیوں، ارادوں اور قسمتوں پر حکمران ہیں اور انسانیت گویا ہر آن بڑھتی ہوئی قوت اور آگہی کے بل بوتے پر ان طاقتوں کی بالادستی سے چھٹکارا پانے اور اپنی مالک آپ بن جانے میں کوشاں رہتی ہے۔ اس کی ساری کشمکش کا مقصد فطرت پر غلبہ حاصل کرنا ہے جو سب سے بڑی مسلمہ طاقت ہے یعنی "زیوس"[1] کی جگہ لینا ہے جو اس طاقت کا مظہر ہے اور بنی نوع انسان پر فطرت کی حکمرانی کی علامت بن چکا ہے۔

اس مکتب فکر کے جدید ماہرین الٰہیات، مثلاً ڈیڈیروٹ[2]، والٹیر[3]، فیورباخ[4] اور مارکس[5] جس انتہائی حیران کن مغالطے میں مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے یونان کی ضیائی دنیا کو جو فطرت کی مادی حدود میں رہتی ہے۔ ازمنۂ قدیم کے عظیم مذاہب کی مقدس اور روحانی دنیا کا ہمسر بنا دیا ہے۔ پھر "زیوس" کے ساتھ انسان کا رشتہ اور "آہورامزدہ"، رام، تاؤ، مسیح اور اللہ کے ساتھ انسان کا رشتہ ان ہر دو کا نہ صرف یہ کہ انہوں نے تقابل کیا ہے بلکہ ہر دو قبیل کے رشتوں کو ایک ہی زمرہ میں شامل کر دیا ہے حالانکہ رشتوں کے یہ دونوں اصناف حقیقتاً ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اول الذکر دنیا میں "پرومیتھیس"[6] جس نے بنی نوع انسان کو "آگ" دی خداؤں کی نظروں سے جبکہ وہ سوئے ہوئے تھے میں چپکے سے اسکو چرا کر زمین پر لے آیا ہے اور اسی گناہ کی پاداش میں خداؤں کے ہاتھوں اسکو وحشتناک سزا ملتی ہے اسکے برعکس ثانی الذکر دنیا میں معلم الملکوت یعنی ابلیس پر اللہ کی لعنت اسلئے ہوتی ہے کہ

---

1. ZEUS
2. DIDEROT
3. VOLTAIRE
4. FEUERBACH
5. KARL MARX
6. PROMETHEUS

دوسرے فرشتوں کی طرح وہ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرکے حکمِ خداوندی کی سرتابی کر بیٹھا ہے۔ علاوہ بریں اسی "الوہی آگ" کو نورِ حکمتِ الٰہی کی شکل میں خدا اپنی وحی کے ذریعہ خود اپنے پیغمبروں کے حوالے کرتا ہے تاکہ اسے بنی نوع انسان تک پہنچا دیں، نیز اولاد آدم کو ظلمات سے نکال کر اس نورِ ربانی کی طرف ان کی رہبری کریں ——— اس تمام مالہ وماعلیہ کے ساتھ جو اس نورِ حکمت کا اقتضا ہے یعنی رحمت و خشیتِ الٰہی۔

ہم نے دیکھا کہ اس آخر الذکر صورت میں "زیوس" کے برعکس خدا چاہتا ہے کہ انسان فطرت کی غلامی کا جوا اتار پھینکے اور ارشاد فرماتا ہے کہ اس کی نجات کا راستہ "پرومیتھیس" کی اسی روشنی کی تلاش ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ عظیم مذاہب کے آفاقی نقطۂ نظر سے خدا بنی نوع انسان کو "زیوس" پر غلبہ پانے کا حکم دیتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "سارے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا ہے اور بحر و بر تمہارے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔"

اس طرح قدیم یونان کی ضمیاتی دنیا کے نقطۂ نظر سے یہ ایک فطری امر ہے اور منطقی لحاظ سے درست کہ "الٰہیات" کو خداؤں یعنی مظاہر فطرت کے اولین نمونوں (ارباب انواع) کی پرستش سے انکار اور خدائی قوانین سے انحراف کے راستے ہی پروان چڑھایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اصالت انسان اور خداؤں کی خدائی کے مابین مخالفت ناگزیر تھی۔

اس بنیاد پر یونانی "الٰہیات" خداؤں کے وجود سے انکار کرکے، ان کی خدائی پر ایمان نہ لا کر اور انسان اور آسمان کے رشتہ کو منقطع کرکے ایسی کائنات تک پہنچنے کی جدوجہد میں مبتلا رہی ہے جس کا مرکز انسان اور صرف انسان ہو اور یہ کہ انسان ہی کی ذات کو حق و باطل کی کسوٹی مان لیا جائے۔ انسان[1] کی شکل و صورت کو حسن کا معیار قرار دیا جائے نیز انہی اعضائے

۱۔ یہیں سے یونان کی بت پرستی میں انسانی پیکر اور عریانی کے مرکز توجہ بننے کی توجیہ ہو (باقی اگلے صفحہ پر)

جسمانی کو اہمیت دی جائے جو انسان کی طاقت اور لذت اندوزی میں اضافہ کرتے ہوں۔

اس انسان مرکزیت[1] نے جس حد تک آسمان دشمنی کا راستہ اختیار کیا وہ ارضی ہو کر رہ گئی اور مادیت کی طرف اس کا میلان ہو گیا لہذا یونانی دور سے لے کر یورپ کے موجودہ دور تک مغرب کی انسیات، مادیت ہی کی طرف کھنچتی چلی گئی اور خواہ فرانس کے قاموسیین[2] کو لبرل مکتب ہو یا مغرب کی بورژوائی نقافت یا مارکسیت، صورت حال یہی کچھ رہی۔

مغرب میں انسیات کو دین و مذہب کے مقابل کھڑا کرنے میں، قرون وسطیٰ کے رومن کیتھولک عقائد کا بھی بڑا ہاتھ ہے کہ عیسائیت کو اہل مذہب کے نام پر انسانیت ہی کا حریف بنا دیا گیا چنانچہ عیسائیت نے بھی ارض و سما کے مابین اسی قابت کو برقرار رکھا جو قدیم یونان و روم میں جاری و ساری تھی۔

پھر یونانی انداز میں جنت سے آدمؑ کے نکالے جانے کی ذمہ داری، انسان کے ازلی گناہ پر ڈالتے ہوئے، عیسائیت نے بھی بنی آدم کو ایک ایسی ملعون و مقہور مخلوق کی طرح پیش کیا۔

تھی ہے نیز یونان کی اس مجسمہ سازی کی جو انسان کے جسمانی اور مخفی اعضائے حسن کو اس قدر اجاگر کرتی ہے کہ سارے عالم میں جس کے چرچے ہیں۔ یہ بات بھی بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ کس طرح یہ انسیات کا مرکزی خیال بن جاتا ہے اور جدید یورپ کی حسن کاری میں جس کو اس قدر نمایاں حد تک دخل ہے۔

[1] علی شریعتی نے اصل میں "انسان گرائی" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ (مترجم)

[2] (ENCYCLOPAEDISTS) کے لئے علی شریعتی نے "اصحاب دائرۃ المعارف" کی اصطلاح استعمال کی ہے چونکہ ہمارے ادب کے لئے یہ ایک غریب اصطلاح ہے اور مفہوم کے اعتبار سے ایک مخصوص دور کے اصحاب فکر کی نمائندہ بھی نہیں، ہم نے لفظی ترجمہ کے ذریعہ اس کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاہم یہ نموز رفتہ ہے وضاحت طلب ہے گو کہ مولوی عبدالحق صاحب کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہ عالم اسفل کی جانب ہبوطِ آدم کا اصل باعث وہ غضبِ الٰہی ہے جو جرمِ خداوندی کی سزا کے نتیجہ میں نازل ہوا ہی نہیں بلکہ عیسائیت نے ہمیشہ کے لئے بنی نوعِ انسان کو ایک نہایت ہی کم نہاد اور ضعیف البنیان گنہگار کا نام دے دیا جو محض قابلِ سرزنش ہی ہے بجز اس طبقہ کے جو ائمہ اور اولیاء پر مشتمل ہو یعنی روحانیت کے علمبرداروں کا طبقہ۔ طرفہ یہ کہ باقی تمام لوگوں کی نجات کا راستہ ان کی اندھی تقلید اور پیروی کرنے میں پوشیدہ ہے، یہ جانے بغیر کہ کیوں اور کس لئے؟ اور اس کا طریقہ جو انہوں نے تجویز کیا یہ تھا کہ ان کے ادارہ سے منسلک ہو جائیں جس کے طفیل میں رسمی طور پر تسلیم شدہ طریقوں سے ہی شئونِ الٰہی کا ظہور اس دنیوی سطح پر ممکن ہے۔

اس اندازِ فکر نے انسیات کو دین و مذہب[1] کا مدِمقابل بنا دیا۔ لہٰذا قانونِ الٰہی کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے لازماً اس قربان گاہ سے ہو کر گزرنا تھا جس پر 'انسیات' کو بھینٹ چڑھا دیا جائے اور قرونِ وسطیٰ میں تو جس کا نام و نشان بھی نہ رہ گیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں عالم یہ تھا کہ سائنس اور ثقافت، اخلاقیات اور روزمرہ کی زندگی حتیٰ کہ آرٹ اور جمالیات میں بھی 'انسیات' پر کسی اعتماد کا فقدان ہی تھا۔ قرونِ وسطیٰ کی حسن کاری اور جمالیات کے شاہکار سارے کے سارے وہ تھے جن میں مافوق البشر اور مافوق الفطرت کی تصویر کشی کی گئی تھی۔

اردو ڈکشنری میں اور معنوں کے ساتھ ساتھ ENCYCLOPAEDIA کے لئے قاموسیین اور دائرۃ المعارف بھی ترجمہ موجود ہے۔

ڈیڈیروٹ 'DIDEROT' اور دوسرے فرانسیسی علماء نے سترھویں صدی عیسوی میں قاموس کی ترتیب کے کام کا آغاز کیا اور بعد کو اسی نام سے موسوم ہو گئے چنانچہ جدید لبرل مکتب کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ (مترجم)

[1] علی شریعتی نے اصل میں خداگرائی کی اصطلاح THEISM کے لئے استعمال کی ہے جس سے مقصود فی الحقیقت دین و مذہب ہی ہے۔ (مترجم)

روح القدس، نجات دہندہ، فرشتے اور مختلف معجزات و کرامات وغیرہ۔ اگر انسانی شکل کہیں دکھائی بھی دے تو وہ یا تو حضرت مسیحؑ کے حواریوں کی یا عیسائیت کے اولیاء کی۔ پھر یہ انسانی شکلیں جو بیوں گی تو سرتاپا ڈھیلے ڈھالے اور لمبے چوڑے چغوں سے ڈھکی ہونگی نیز عام طور پر ان کے چہرے ملکوتی ہالۂ نور کے اندر مستور ہونگے یا اس کی روشنی میں جھلملاتے ہونگے۔

اور ادب ؛ ادب انہی قصے کہانیوں کی نشر و اشاعت !

آرٹ ؛ ان افسانوں کی صورت گری !

سائنس ؛ انہی تصورات کی توثیق و تصدیق !

اخلاقیات ؛ نفس کشی تاکہ ازلی گناہ کا کفارہ ادا ہو سکے۔

دنیوی زندگی ؛ آخرت کی خاطر ایثار و قربانی۔

ہم نے دیکھا کہ قرون وسطیٰ کے کیتھولکی نظام میں اصالتِ انسان کی نفی ہی خدا تک رسائی کا واحد راستہ ہے اور موجب خوشنودی خداوندی ہے۔ ان معنوں میں خدا کا عیسائی تصور "زیوس" کے کس قدر مشابہ ہے!

جدید یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد کی انسیات کے بارے میں جس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قدیم یونان کی انسیات ہی کا تسلسل ہے۔ اسی طرح یہ کہنے میں بھی ہم حق بجانب ہوں گے کہ قرون وسطیٰ کی عیسائیت میں جو سادی عنصر پایا جاتا ہے وہ بھی یونان کی ضمیات ہی کا تسلسل اور اسی سے ماخوذ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کی دنیا میں خواہ قرونِ وسطیٰ ہو یا دور حاضرہ، ہر ایک ہی یونان کے سرچشمے سے سیراب ہوتا ہے۔

چنانچہ مغربی ثقافت کی تاریخ دو متضاد فکری دھاروں کا تواتر ہے جن کے سوتے ایک ہی ہیں۔ چاہے مذہب کی بات ہو یا سائنس کی۔

اب صورتحال واضح ہے۔ زمانۂ حال میں مخالف سمتوں میں بہنے والے دونوں فکری دھارے جن کا منبع و مبداء یونانی انسیات ہی ہے یعنی بورژوائی لبرل مکتب اور مارکسیت، کیا عملی اعتبار سے اور کیا نظری اعتبار سے، انسان کے مادی نقطۂ نگاہ میں برابر کے شریک ہیں۔ مارکس اور والٹیر، ہر دو نے انسان کے بنیادی جزو ترکیبی کی روحانی جہتوں کی طرف سے یک لخت آنکھیں بند کر لیں۔ بورژوائی لبرل معاشرہ اور منظم کمیونسٹ معاشرہ، بالآخر انسانیت، انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ کے بارے میں مطمح نظر کے لحاظ سے ایک ہی نکتہ پہ باہم مل جاتے ہیں۔ کمیونسٹ معاشرہ کے بورژوائی رجحانات، جنہیں یکسر رد کر دینا اب ممکن نہیں، محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں اور نہ کوئی انحراف یا رجعت پسندانہ کجروی ہے کیونکہ ہر چیز کی معراج بہرحال انسان ہے اور یہ بات بالکل فطری ہے کہ وہ فلسفیانہ مکاتب جو انسان کا یکساں تصور رکھتے ہوں بلا لحاظ اس کے کہ ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی، آخری نوبت پر انہیں ایک ہی راستہ پر گامزن ہو کر اپنے منتہا کو پہنچنا ہے۔

جو کچھ بھی ہو مغربی بورژوائی لبرل مکتب اور مارکسیت دونوں ہی انسیات اور اپنی انسان دوستی کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ اول الذکر کا دعویٰ ہے کہ فرد کو سوچنے سمجھنے، سائنٹفک تحقیقات، عقلیات پر مبنی بحث و استدلال اور معاشی جد و جہد اور پیدائش دولت کے لئے آزاد چھوڑ کر وہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے اور پھلنے پھولنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ثانی الذکر بھی اسی نصب العین تک پہنچنے کا مدعی ہے لیکن متذکرہ صدر آزادی کو سلب کر کے یہاں افراد ایک آمرانہ قیادت کے شکنجہ میں جکڑ جاتے ہیں۔ یہ قیادت سارے کے سارے معاشرہ کو ایک وحدت تصور کرتی ہے اور اس کا نظام جو چلانا چاہتی ہے وہ بھی ایک ہی نظریہ پر مبنی، جس میں اکتا دینے والی یکسانیت لوگوں کے حصہ میں آتی ہے نہ کہ

اقدار اور انسان کی زندگی کے بارے میں اصل فلسفہ ہو بہو وہی ہے کہ بورژوائی طرز زندگی کو سارے معاشرہ کے لئے عام کر دیا جائے، ہر چند کہ لبرل بورژوائی معاشرہ میں وہ خوابیدہ رہتا ہے۔ لہٰذا یہ کوئی مضحکہ خیز بات نہیں جو کسی نے کہی ہے کہ "کیا مارکسیت، بورژوائی طبقہ سے زیادہ بورژوائی نہیں؟" خواہ یہ ازراہ مزاح کہا گیا ہو، 'انسیات' کے نقطۂ نگاہ سے تو امر واقعہ ہے۔

جس طرح مغرب کا بورژوائی لبرل مکتب اپنے آپ کو تاریخی 'انسیات' کی آوردہ ثقافت ہی کا وارث سمجھتا ہے اور مارکسیت کل کی کل انسانیت کے لئے 'انسیات' کو شرمندۂ تحقیق کرنے کا وسیلہ بن کر پیش ہوتی ہے، اسی طرح 'وجودیت' بھی 'انسیات' ہی کا ایک مکتب ہے اور اس میں شک نہیں کہ مذکورہ صدر ہر دو دعویداروں کے مقابلہ میں جائز طور پر اس کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

لیکن ایک چوتھی عظیم فکری رو ابھی اور ہے جو ان تینوں سے قدیم تر بھی ہے اور جس کی جڑیں عمیق تر بھی ہیں اور وہ ہے مذہب کا آفاقی نقطۂ نگاہ۔ ماکہ ہر مذہب اپنے بارے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ انسانیت کی مختتم نجات ہی اس کا اصل منصب ہے لہٰذا ہر ایک لازماً اپنے مخصوص فلسفۂ تخلیق انسان کا حامل بھی ہے۔ ان معنوں میں کہ جب تک انسان کے بارے میں واضح نہ ہو جائے کہ وہ کیونکر وجود میں آیا ہے، نجات انسانی کے تعلق سے وہ کچھ کہنے کا اہل نہیں۔ گویا تمام مذاہب تخلیق آدم سے ہی شروع کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ رائج العصر چاروں متنوع فکری دھاروں کی روشنی میں جو بنی نوع انسان ہی کو بعینہ ایک اصول مانتے ہیں یا ایک اشرف نوع تصور کرتے ہیں اور اپنے اپنے ادعا کا انہی بنیادوں پر اطلاق کرتے ہیں۔ ہم انسان کی ایک ایسی تعریف کی کوشش کر سکتے ہیں

جو مسائل زیر بحث کے تعلق سے جداگانہ راہوں کا واحد اور مشترک نقطۂ آغاز ہے۔

انسانی وجود کا خاکہ آواخر اٹھارویں صدی اور اوائل انیسویں صدی کے انتہا پسندوں نے جو یورپ میں جدید 'انسیات' کے سب سے نمایاں مفکرین و مبلغین میں سے تھے۔ ۱۸۰۰ء کے شائع شدہ اپنے ایک منشور میں یہ تک اعلان کر دیا کہ "اخلاقیات میں سے خدا کو نکال کر اس کی جگہ ضمیر کو رکھ دو۔" ان کا خیال تھا کہ انسان ایک ایسی ہستی ہے جس کے اندر ایک ضمیر ہے اور وہ اس ضمیر کا اپنے آپ مالک ہے اور یہ کہ اس کی اصل اور ذاتی سرشت ہی جس کا منبع و ماخذ ہے، نیز طبع انسانی جس کی مقتضی ہے۔ طبع انسانی اور ضمیر پر یہی اعتماد، موجودہ دور میں مبنی بر دہریت 'انسیات' کی اصل بنیاد ہے۔

سائنٹفک تجرباتی دور کے آغاز اور خاص طور پر عمرانیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ (عمرانیات جس نے نفسیات کو تنہا کر کے میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔) انسانی فطرت کو بحیثیت ایک بنیادی اصول پہلے تو شک و ارتیاب کا سامنا کرنا پڑا اور پھر یک لخت اسے ترک ہی کر دیا گیا۔ اس منزل پر ضمیر کو بجائے اس کے کہ انسان کی فطرت کی گہرائیوں سے ماخوذ فرض کر لیا جائے۔ اسے ایک اجتماعی ضمیر کی حیثیت دے دی گئی جس کی جڑیں لازمی طور پر انسان کے تغیر پذیر عمرانی ماحول میں جاگزیں ہیں اور اس لحاظ سے ضمیر خود بھی تغیر پذیر ہے لہٰذا اخلاقیات بحیثیت ایک مقدس اور ماورائی مجموعۂ اقدار ابتلاء کا شکار ہو گئے اور قریب معدوم۔

تاہم جدید انسیات، جس پر مغربی یورژوائی لبرل مکتب ایک نظام کی حیثیت سے قائم ہے۔ نیز بنی نوع انسان کو ابدی اخلاقی محاسن سے متصف خیال کرتا اور ایسی اشرف

واعلیٰ، ماورائے مادہ اقتدار کا حامل جن کے باعث انسان کو اصل مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور یہیں گروہ فطرت اور مافوق الفطرت کے برخلاف، صرف اور صرف اصالتِ انسان پر تکیہ کرتا ہے گویا جدید الٰہیات بحیثیت مجموعی، اخلاقی فضائل کی خوشہ چینی تو مذہب سے کرتی ہے لیکن اخلاق کی مذہبی کسوٹی سے انکار اور خدا پر ایمان لائے بغیر اس امر کا اعلان بھی کرتی ہے کہ اخلاقی محاسن کو اپنا کر روحانی ترقی اور نشوونما کا امکان ہے۔

اس مسئلہ میں مارکسیت کے دو باہم مخالف پہلو ہیں پہلا تو یہ کہ مارکس نے اپنے زمانہ کے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی ہے اور اس پر زبردست حملے کئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ مارکس ہی کو ہم ایک کمیونسٹ معاشری نظام کی داغ بیل ڈالتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔ آخر الذکر گویا مارکسیت کا اثباتی پہلو ہے اور اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس نے کمیونسٹ معیشت و سیاست کے انقلابی جوش و خروش کی رو میں اخلاقی قدروں کے تعلق سے اپنے حیرت انگیز احساسِ بے پایاں کو دھندلانے نیز خود کو محض ایک اور سیاسی قائد کے پیکر میں ڈھال لینے کا موقع دے دیا جو اقتدار کا بھوکا اور سیاسی فتوحات کا دلدادہ ہو۔

لیکن اس کے تنقیدی روپ میں ـــــ یعنی مارکس کا زیادہ جاذبِ نظر پہلو جس نے ان بے شمار لوگوں کے ذہنوں اور دلوں کو موہ لیا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم اور تعدی کا شکار رہے ہیں۔ وہ اپنے حساس طبع ہونے کا برملا اظہار کرتا ہے جب وہ اس نظام پر اس طرح وار کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام' بنی نوع انسان کی اعلیٰ اقدار پہ پانی پھیر دیتا ہے تو کسی صوفی منش کا انداز اختیار کرتے ہوئے انسان کے بارے میں یوں گویا ہے کہ انسان ایک غیور، خود آگاہ، خود پسند، راست باز، حریت پرست، خود شناس اور مکارم اخلاق سے متصف ہستی ہے جو ایک بے رحم، بے حس اور ظالم معاشی نظام، نیز رقابت م

استحصال اور خود غرضیوں سے بھرپور فاسد سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ مارکس چیخ اٹھتا ہے۔

"محنت بنی نوع انسان کا جوہر ہے لیکن سرمایہ داری اسکو ایک مادی شے خیال کرکے اس کی کوئی بھی قیمت مقرر کر دیتی ہے اور اس طرح مزدور اپنے پیٹ کا غلام بن کر رہ جاتا ہے"

جب وہ اصول پیدائش، عوامل پیدائش کی قدر، معاشی فراوانی اور خاص طور پر اشتراکیت کے تحت سارے کے سارے معاشرہ کے لئے ایک معاشی منصوبہ کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے تو اس کا صوفیانہ لب ولہجہ ٹھیٹ مادیت کا قالب اختیار کرلیتا ہے۔

مارکسیت کے سلبی یعنی تنقیدی پہلو میں بنی نوع انسان کی افضلیت کے وہ راگ الاپے جاتے ہیں کہ آروں[1]، ڈوورگر[2] حتیٰ کہ ہنری لیفبر[3] جیسے عالموں کو یہ کہنا پڑا (خواہ از راہِ تفنن یا سنجیدگی سے) کہ مارکس کے فلسفہ اور تنقیدی ادب میں "صوفیانہ انسیات" کا عنصر پایا جاتا ہے۔

وجودیت تو فلسفہ آرائی کا طومار ہے۔ انسان کے بارے میں وہ اس طرح بات کرتی ہے گویا ساز ہستی کے اس تار کی مانند ہے جو سب سے الگ تھلگ معرض وجود میں آیا ہو اور کائنات میں یونہی پڑا ہو۔ نیز اپنی سرشت اور خصوصیات کے تعین کے لئے وہ نہ تو فطرت اور نہ خدا کا محتاج ہو لیکن انتخاب کی قدرت رکھتا ہو اور اس طرح اپنی ماہیت کی خود ہی تعمیر و تخلیق کر رہا ہو۔

مشرق کے عظیم مذاہب میں خالق کائنات کے ساتھ بنی نوع انسان ایک منفرد

---

۱ ARON   ۲ DUVERGER

۳ HENRI LEFEBVRE

رشتہ میں منسلک ہیں۔ زرتشت کے مذہب میں انسان آہورامزدہ کا نہ صرف رفیق ہے بلکہ عظیم معرکۂ تخلیق میں اس کا حلیف بن جاتا ہے تاکہ انگرامینو اور اس کے ساتھیوں پر نیکی غلبہ پالے۔

'وحدۃ الوجود' کے قائل رمزی مذاہب، بالخصوص ہندومت کی رو سے خدا، انسان اور محبت گویا تینوں جہانِ وجود کی تخلیق نو کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں مشغول ہیں۔ یہاں خدا اور انسان باہم گھل مل گئے ہیں اور ایک دوسرے سے لاینفک ہیں۔ جس طرح ہمارے بعض عظیم صوفیا کے ادب میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔

اسلام میں ہر چند کہ انسان سے خدا تک کا فاصلہ تو غیر متناہی ہے لیکن خدا سے انسان تک وہ بالکلیہ ناپید ہے۔ عالم تخلیق میں انسان ہی اصل ہستی ہے جو روح الٰہی کا مسکن خدائی امانت کا مسئول اور صفات ربانی کا حامل بننے کا اہل بھی ہے۔[1]

بہت ہی اساسی نوعیت کے وہ اوصاف جن کے بنی نوع انسان ہی خوگر ہو سکتے ہیں اور جن پر مسلکِ انسانیت کے حامی بالعموم متفق ہیں، ان کی بنیاد پر جو تصویر ابھرتی ہے وہ حسب ذیل ہے:-

۱- انسان کی ہستی اولیٰ ہے یعنی تمام موجوداتِ فطرت و ماورائے فطرت میں صرف انسان ہی ہے جس کی خودی پابند نہیں اور باعتبار اصل وہی شرف کے قابل ہے۔

۲- انسان ایک مستقل بالذات حیثیت ہے اور یہ اس کی سب سے زیادہ خارق العادۃ اور

---

[1]: تخلقوا باخلاق اللہ

ناقابلِ توجیہہ قوت ہے۔ مشیت ان معنوں میں کہ ایک مستقل بالذات علتِ اولیٰ کی حیثیت سے تعلیل کے اس زنجیرہ میں قدم رکھ چکی ہے کہ عالمِ فطرت، تاریخ اور کل معاشرہ تمام تر جس کے تابع مطلق ہیں اور جبر و قدر کے اس پورے سلسلہ میں وہ مسلسل دخیل و کارفرما بھی ہے۔ ارادہ کی اس آزادی اور اختیار کی قوت، ان سرد و واجبات وجود نے انسان کو خدائی شان عطا کر دی ہے۔

یہ اس کی سب سے زیادہ بے ساختہ صفت ہے

۳۔ انسان صفتِ آگہی سے متصف ہستی ہے

آگہی ان معنوں میں کہ غور و تعمق کی حیرت انگیز اور اعجازی قوت کی بدولت، وہ عالمِ خارج کے عین حقائق کو حیطۂ عقل میں لانے نیز ان اسرار کا انکشاف کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو بطورِ دیگر حواس سے مخفی رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حقیقت کا تجزیہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ صرف محسوس و معلول کی سطح تک پہنچ کر نہیں رک جاتا بلکہ محسوسات سے آگے کیا کچھ ہے۔ اس کی بھی چھان بین کرتا اور معلول سے علت کا استقرا بھی کرتا ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف تو اپنے حواس کی حدود سے پرے نکل جاتا ہے اور دوسری جانب اپنے وجود کی بساط بے ثبات کو ماضی و مستقبل تک پھیلا دیتا ہے، یعنی ان زمانوں میں بھی جب وہ بھرپور طور پر خود موجود ہی نہ ہو۔ اس کے علاوہ اپنے ماحول کو صحیح معنوں میں بڑی گیرائی و گہرائی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے آتا ہے۔

پاسکل[1] کے الفاظ میں انسان ایک ضعیف اور ناتواں تنکہ سے بڑھ کر نہیں۔ کوئی حقیر سا قطرہ اس کو فنا کرنے کے لئے کافی ہے لیکن خواہ ساری دنیا اس کو فنا کرنے پر تلی ہوئی ہو وہ

---

[1] PASCAL

بہر صورت سارے عالم سے افضل و اشرف ہے۔ عالم تو اس سے بے خبر ہے کہ وہ انسان کو فنا کر رہا ہے لیکن انسان اس سے ضرور آگاہ ہے کہ اس کو فنا کیا جا رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آگہی وجود سے بھی برتر جوہر ہے۔

۴۔ انسان ایک خود آگاہ ہستی ہے [لے]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہی ایک ذی حیات ہے جو اپنی موجودگی کا علم رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا مطالعہ آپ کرنے اور اس طرح خود کا تجزیہ و تحلیل کرنے، خود کو جاننے اور خود اپنی قدر پہچاننے اور نتیجتاً خود میں تغیر و تبدل کر لینے کے بھی قابل ہے۔ جیسا کہ ہمارے دور کے عظیم تاریخ داں فلسفی ٹائن بی [لے] کا قول ہے "دور حاضر کا تمدن ان معنوں میں تاریخی اعتبار سے تکمیل کے انتہائی مرحلہ پر پہنچ چکا ہے کہ صرف اور صرف اسی تمدن کو علم ہے کہ وہ زوال پذیر ہے۔"

۵۔ انسان ایک خالق بھی ہے

اس کے کردار کا یہ تخلیقی پہلو اس کو عالم فطرت سے یکسر جدا کر کے خدا کا جلیس بنا دیتا ہے۔ اسی صلاحیت کی بدولت ایک اعجازی طاقت اس کے زیر تصرف

لے یہاں علی شریعتی نے آگاہ اور خود آگاہ، ہر دو کو جداگانہ معنوں میں الگ الگ سرخی کے تحت بیان کیا ہے۔ ہم نے علی شریعتی کی اصطلاحات بجنسہ برقرار رکھی ہیں کیونکہ دونوں میں جو فرق ہے وہ متن کے پڑھنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

اس نے آگاہ سے در اصل ایک علیم و خبیر کا مفہوم مراد لیا ہے جو مطلق علم کے معنوں میں، واقفیت کے معنوں میں اور باخبری کے معنوں میں لیا ہے۔ رہا خود آگاہ تو اس کا مطلب صاف ہے یعنی وہ جو اپنے نفس، اپنی ذات یا اپنے وجود اور اپنے آپ کے بارے میں شعور رکھتا ہو یعنی شاعر بالذات، جسے نفس کا عرفان حاصل ہو۔ (مترجم)

لے TOYNBEE

ہوتی ہے جس کے باعث وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے وجود کے فطری حدود و امکانات کو پھاند کر ان کے ماوراء نکل جائے۔ پھر یہ طاقت، وجود کو لامحدود وسعتوں اور پہنائیوں سے مالامال کر دیتی ہے اور جو کچھ فطرت انسان کو دینے سے قاصر رہتی ہے وہ اس کے حصول پر قادر ہو جاتا ہے۔

تخلیق کی یہ صفت، قلب فطرت کی گہرائیوں تک نفوذ کر جاتی ہے چنانچہ عالم فطرت میں وہ شئے موجود نہ ہو جس کا وہ طلب گار ہے تو پھر اس کی خود ہی تخلیق کر لیتا ہے۔ اپنے اسی وصف کے ذریعہ اس نے ترقی کے ابتدائی دور میں تو آلات و اوزار بنائے اور بعد کے دور میں آرٹ اور ہنرمندی کو وجود بخشا۔

۶ - انسان ایک تصوریت پسند ہستی ہے

آئیڈیل کی پرستار، مطلب یہ کہ وہ "ہے" پر کبھی بھی قانع نہیں بلکہ اس کی قلب ماہیت کر کے اس کے درپے ہوتا ہے "جو ہونا چاہیئے" اسی لئے وہ ہر دم اور پیہم تخلیق کے عمل میں لگا رہتا ہے۔ پھر وہ اس کا بھی مظاہرہ کرتا ہے کہ صرف وہی ایک ہستی ہے جو اپنے ماحول کی آفریدہ نہیں بلکہ ماحول آفریں ہے یا سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے تصور کو "واقعیت" میں ڈھالنے میں سرگرم عمل رہتا ہے، اس طرح وہ نہ صرف یہ کہ ہر آن حرکت کی حالت میں ہوتا ہے اور حرکت بھی کمال کی جانب۔ بلکہ دوسرے جانداروں کے برعکس وہ اپنے ارتقاء کی راہ بھی خود ہی متعین کر لیتا ہے اور اس خصوص میں پیش بینی سے بھی کام لے سکتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور اس کی حرکت پذیری میں تصوریت کو ایک بڑے عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیتی کہ "واقعیت" کے حصار میں یعنی موجود طرز حیات یا فطرت کی بندشوں ہی میں عافیت سمجھ لی جائے۔ یہ قوت وہ ہے کہ عالم طبیعی ہو یا روحانی،

ہر آئینہ انسان کو تحقیق و تخلیق، انکشاف و اختراع، نیز غور و تعمق سے کام لینے اور حقیقت سے ہمکنار ہونے پر اکساتی رہتی ہے۔

ادب، آرٹ، صنعت گری اور بنی نوع انسان کا پورا ثقافتی سرمایہ اسی طرح ہستی کی تجلی گاہ میں جوہر آن آئیڈیل کی جستجو میں رہتی ہے۔ کائنات کی کوئی طاقت اس کی راہ کا سنگ گراں بن جائے، یہ اسے ہرگز گوارا نہیں۔

۷۔ انسان کی ہستی اخلاق سے مرکب ہے

یہیں اگر اقدار کے انتہائی اہم اور معنی خیز سوال سے سابقہ پڑتا ہے۔ اقدار در اصل وہ کڑیاں ہیں جو انسان کو کسی نظریہ، کسی کردار، کسی عمل یا کسی حالت کے ساتھ باہم منسلک کر دیتی ہیں جہاں ایسے محرکات معرض بحث میں آتے ہیں جو مفادات سے بالاتر ہوں۔ اقدار ہی کو مقدس رشتوں کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ احترام و عقیدت اور پرستش کے بندھنوں سے استوار ہوتے ہیں اور لوگوں میں یہ احساس جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ان رشتوں کی خاطر اپنی زندگیوں تک کو وقف اور نچھاور کر دینا جائز ہے۔ یہاں کسی سائنٹفک یا عقلیاتی یا طبیعی توجیہہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ فدائیت کے اس احساس اور لگن کو بنی نوع انسان کی سب سے منزہ شانِ وجود سمجھنا چاہیے جس کا اعتراف تاریخ کے ہر دور میں سارے کے سارے مذاہب اور ثقافتوں میں ہوتا رہا ہے کہ سب سے گرانقدر متاع عزیز یہی ہے اصل شکوہ و عظمت اسی سے عبارت ہے۔ اسی کا نام ہے عشق کا جذبہ گراں مایہ اور معجزات عالم کا شاہکار اسی کو کہتے ہیں۔ انہی سب سے دنیا کی تمام قابلِ ذکر اور عظیم ثقافتوں کا ضمیر تیار ہوتا ہے۔ وہ ثقافت خواہ کسی بھی مذہب و ملت کا سرمایہ ہو۔

چنانچہ بنی نوع انسان کی زندگی میں اقدار انسانی کی تخلیق کرنے والوں میں سب ہی

قسم کے لوگ شامل ہیں۔ مثلاً سائنس، ادب یا آرٹ کی خاطر اپنے جسمانی وجود کو فراموش کر دینے والے، مذہب کے نام پر شہید ہونے والے، حق کی تلاش کرنے والے اور مختلف قوموں کے ہیرو۔ نیز ایک ایسا شخص جو شادی بیاہ کے معاملہ میں مصلحت آمیزی پر عشق و محبت کو ترجیح دے اور وہ جو اپنے عقائد، اپنے وطن یا انسانیت کے معاملہ میں ذاتی عشق و محبت حتیٰ کہ اپنے آپ کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔

اقدار اور افادہ، دو متضاد اصطلاحیں ہیں۔ یہ اقدار ہی کا پاس و لحاظ ہے جو انسان کو عالم فطرت کی تمام ہستیوں سے بے نیاز کر کے ان پر تفوق عطا کرتا اور ایک غیر مادی وجود بخشتا ہے۔

عالم فطرت میں اقدار کا اپنا کوئی وجود نہیں اور نہ کوئی خارجی یا مادی تشخص ہے اسی لئے عینیت، ان کے وجود کو تسلیم نہیں کر سکتی کیونکہ انسان نہ ہو تو اقدار بھی نہیں۔ یہاں ہم ایک ایسے نتیجہ پر پہنچتے ہیں جس سے کوئی مفر نہیں کہ اقدار کا ظہور انسان ہی سے ہوتا ہے لہٰذا ان کی حیثیت موضوعی اور تصوراتی ہو گی ایسی صورت میں عینیت کے حامی ان کا انکار کرنے پر مجبور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی سب سے ممتاز اور اعلیٰ تر شان وجود سے کیونکر کوئی انکار کر سکتا ہے؟ بلاشبہ یہ ایک دشوار مرحلہ ہے اور شرمناک بھی نیز پریشان کن۔ تاہم ایک عینیت پسند میں اس کے اثبات کی مجال نہیں تاآنکہ وہ مادی حقائق پر انسان کی اور مادہ پر ذہن کی فوقیت تسلیم نہ کرے مگر یہ بات ایسی ہے کہ اس سے عینیت ہی کا انکار لازم آتا ہے۔

چنانچہ عینیت پسند فلاسفہ ——— مثلاً مادیین اور علم فطرت کے حامی جو بیشتر عمرانیات، نفسیات اور علم الانسان کے سائنٹفک اور فلسفیانہ ظن و گمان پر انحصار

کرتے ہیں ــــ اقدار کے وجود کا انکار کرنے میں ذرہ برابر پس و پیش نہیں کرتے۔ وہ انہیں لاطائل مفروضات، اوہام باطل یا موروثی عادات یا سماج کے مروجہ طور طریق کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ وہ یا تو اس "حیوان ناطق" کے کالبد مادی سے یا اس کے جسمانی اعضا کی جذباتی کیفیات سے ماخوذ ہیں۔ عینیت کے حامی اپنے سنگدلانہ اور بے رحم لیکن نظاہر کیمیاتی تجزیہ کے ذریعے اقدار کے اصلی تقدس اور محاسن کو مسخ کر دیتے ہیں پھر اس طرح ان کی چیر پھاڑ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں جیسے کسی نازک سے عضویہ نامیہ کو بے جان مادہ کے اجزاء میں تحویل کر رہے ہوں۔

پس عینیت کے حامی جب کسی ایسے شخص سے دو چار ہوتے ہیں جو کسی سائنسی انکشاف کی جستجو میں خود کو فراموش کر چکا ہو یا جس نے اپنے ملک کی خاطر اپنی زندگی ہی وقف کر دی ہو یا ذاتی مفاد پر اپنے آئیڈیل کو ترجیح دیتا ہو یا جس کے نزدیک سود و زیاں اور لذت اندوزی کے مقابلہ میں حسن اور نیکی زیادہ قابل قدر ہو تو ان اشخاص کے احساسات کی توجیہہ وہ بالکل اس انداز میں کرتے ہیں جیسے رسم ختنہ میں شرکت۔

ٹھیک یہیں آکر مارکسیت لغزش کھا جاتی ہے اور ایسے موقف میں پھنس جاتی ہے جسے نظریہ کے اعتبار سے بہت ہی کمزور کہنا چاہیئے۔ مارکس تو سارتر[1] کی طرح محض مادی فلسفی نہیں جو علی الاعلان یہ کہہ سکے کہ "جو کچھ بھی تم نیک نیتی اور اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ پسند کرو اسی کا نام خیر اور قدر ہے (خواہ اس کے ذریعہ شر اور نفسانیت ہی مقصود ہو)" مارکس تو اجتماعی نظریہ کا پرستار بھی ہے جو اپنے دور کے پرولتاری طبقہ کا سیاسی رہنما بن چکا

---

[1] SARTRE

ہے اور "تمثیل گاہ عالم" میں ایک جماعت کے بانی کی حیثیت سے خصوصی لائحہ عمل کا داعی ۔ سارتر کے برعکس وہ اعلان کرتا ہے "تمہارے انتخاب کے لئے یہ یہ چیزیں ہیں اور بس"۔ پھر آگے چل کر کہتا ہے "ان چیزوں کے لئے تم ذمہ دار ہو اور ان ذمہ داریوں کے پیش نظر تمہیں چاہیے کہ مخصوص نصب العین کو شرمندۂ حقیقت کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہیں، اور ایثار و قربانی سے کام لیں یعنی" اس جدوجہد کے لئے تمہیں اپنے مادی محرکات، معاشی ضروریات، طبعی احتیاجات اور ذاتی مفادات حتیٰ کہ اپنی متاع حیات کی بھی بھینٹ چڑھانی ہو گی۔"

لہٰذا اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ مارکس بھی مخصوص "مجموعہ اقدار" کا ذکر کرتا ہے اقدار جو ذاتی مفاد کے حریف لیکن انسان کے مادی وجود سے ماورا ہوں۔ پس جب وہ سرمایہ دارانہ نظام اور بورژوائی نفسیات کی بات اس طرح کرتا ہے کہ وجودی اقدار کو یہ دونوں صرف دولت و زر کے پیمانہ ہی سے ناپتے ہیں اور انسانیت کو اخلاقی انحطاط اور تباہی کی طرف گھسیٹ کر ایک فاسد معاشرہ کی تعمیر کرتے ہیں تو وہ گویا اخلاقی اقدار ہی پہ اپنے افکار کی بنیاد رکھتا ہے۔

تاہم جب وہ جدلیاتی مادیت پر بحث کے دوران اپنے افکار کے عظیم الشان قصر کی نمائش کر رہا ہو تو اپنے آپ کو عینیت کا حامی ثابت کرنے کی بھرپور جدوجہد کرتا ہے نیز انہی مادی اور حیاتیاتی معیارات کو در خور اعتنا خیال کرتا ہے جو علوم فطرت کے چوکھٹے میں چست ہو سکیں۔ اس صورت میں وہ دوسرے تمام مادئین ہی کا اتباع کرتے ہوئے جن میں کٹر اور اشد حامیانِ عینیت بھی شامل ہیں۔ اقدار انسانی کو اس حد تک گرا دیتا ہے جیسے وہ بالکل ہی بے بنیاد اور کم سواد ہوں۔

مارکس بار بار اور بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے کہ اس نے انسان کے وقار کو برقرار رکھنے کی خاطر سائنٹفک طریقہ پر "مداری کے تماشے" کا آغاز کر دیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ جدلیات میں انسان کا وہی تصور نہیں جو علوم فطرت یا مادیت میں پایا جاتا ہے — یعنی ساز کائنات کا ایک پرزہ جو معین مادی وجود رکھتا ہو — بلکہ وہ اسے ایک ایسی ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے جو ہنوز حالت ارتقا میں ہے اور تاریخی جدلیات کے جلو میں آگے کی طرف رواں دواں ہے۔ اس تدبیر کے ذریعہ مارکس انسانیت کو قلمرو فطرت سے نکال کر تاریخ کی قلمرو میں پہنچا دیتا ہے۔

لیکن رتبہ کی اس تبدیلی سے انسان کے وقار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ مارکس کی رو سے "تاریخ" مادی فطرت ہی کی حرکت کا تسلسل ہے۔ اس طرح انسان باعتبار تاریخ بالآخر فطرت پرست ہی کے میکانی عالم فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے جس کا تصور ایک مادی ہستی کی حیثیت سے ہی ممکن ہے پس مارکس وہ تمام اقدار جو معاشرہ کے نام پر انسان کو ایک ہاتھ سے بخشتا ہے، جدلیاتی مادیت کے ذریعے دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیتا ہے۔

یہاں چینڈل[1] کے یہ الفاظ بڑے ہی برمحل معلوم ہوتے ہیں "فلسفی مارکس انسان کی تمام حقیقی اقدار کو تو جدلیاتی مادیت کی گاڑی کے پہیوں تلے روند کر چکنا چور کر ڈالتا ہے لیکن قائد و سیاست داں مارکس انہی اقدار کو بڑی گرم جوشی سے سراہتا اور ولولہ انگیز تعریف و توصیف کے ذریعہ عوام کو اقتدار اور غلبہ حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دیتا ہے"۔

لے CHANDEL

ان اقدار پر مارکس کا انحصار، درآں حالیکہ وہ ان کے مستند ہونے پر یقین نہیں رکھتا صرف ایک جنگی حربہ نہیں ؟ اگر ایسا ہے تو بالکل بدیہی بات ہے کہ یہ ایک سیاسی شعبدہ بازی ہے۔

غرضیکہ افکار کے رائج العصر چاروں زیر غور دھاروں، بنیادی طور پر اور بلا اختلاف جس ادعا میں شریک ہیں، اس پر غور کرنے کے بعد ہم انسان کی حسب ذیل تعریف کا استنباط کر سکتے ہیں۔ عالم فطرت میں انسان ایک اولی ہستی ہے جس کی اصل منفرد ہے اور خواہ مخلوق کی حیثیت میں یا قدرتی مظہر کے طور پر وہ اشرف بھی ہے اور مستثنیات میں سے ہے چونکہ وہ ارادہ کا مالک ہے لہذا ایک مستقل بالذات علت کی طرح عالم طبیعی میں دخل انداز بھی۔ امتیاز و انتخاب کی صلاحیت کا حامل ہے اور پہلے سے مقرر شدہ قسمت سے الگ اور ہٹ کر اپنی نئی تقدیر کی تخلیق میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ یہ قوت ایسی ہے کہ اس پر ایک پابندی اور ذمہ داری عاید کرتی ہے جو بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے "تاوقتیکہ اقدار کے اس سلسلہ کے ساتھ اس کا رشتہ نہ جوڑ دیا گیا ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ انسان ایک تصوریت پسند ہستی ہے جس کی ساری جدوجہد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ واقعی کی قلب ماہیت "حقیقی" میں ہو جائے ـــ یعنی "جو ہے" کی "جو ہونا چاہیے" میں ـــ خواہ عالم طبیعی ہو کہ معاشرہ کہ اس کی اپنی خودی۔ قلب ماہیت کی یہی کوشش اسے تکمیل ذات کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔ انسان کی ہستی اپنے عمل سے ایک ایسی طاقت کا بھی مظاہرہ کرتی ہے جو عالم فطرت کی ضد ہے۔ ان معنوں میں کہ وہ اپنی کارفرمائیوں سے عالم کی اور خود اپنی فطرت کی تخلیق نو کرتی ہے۔ اس تخلیقی طاقت سے لیس ہو کر انسان اپنی اور عالم طبیعی کی مزید ترقی کے لیے بھی اس کو بروئے کار لاتا ہے۔ چنانچہ عالم

مادی میں جو کمی رہ گئی ہے وہ اس کمی کو حسن، آرٹ اور ادب کی تخلیق کر کے پورا کر دیتا ہے اور صنعت وکاریگری کی تخلیق کے ذریعے اپنے لئے وہ کچھ مہیا کر لیتا ہے جو فطرت اس کو دینے سے قاصر رہی ہے۔

انسان ایک فکر کرنے والی ہستی بھی ہے اور اس ماورائی رجحان کی بدولت اس کا اپنا اور عالمی شعور نمو پاتا ہے۔ نیز معاشرہ میں اور عالم میں اور زمان میں اس کی بشری حیثیت کے بارے میں اس کا شعور۔ فکر کی صلاحیت کی بدولت وہ اپنی جولان گاہ وجود کو وسعت دے کر جسمانی وجود کی سرحدوں کے اس پار لے جاتا ہے اور اس کا طائر عقل ایک طرف تو محسوس مظاہر کی تہہ میں پہنچ کر دانۂ زیرِ دام کی خبر لاتا ہے تو دوسری جانب مادی دنیا کے سقف زریں کے پرے ہی پرے اپنی جولانی دکھاتا ہے۔ ماحول کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں لیکن اس کا سفر جاری رہتا ہے ــــ وجود کے اس تصعیدی عمل کے دوران جو اس کی ذات کے اندر سلامتنا ہی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسان ایک جوہر پاکیزہ کا حامل ہے جس سے تقدس کے چشمے رواں ہوتے ہیں۔ اسی جوہر پاکیزہ کی عبادت انسان کی وہ شان وجود ہے جو اس کے ماورائے عقل و فطرت، شئون وجود میں سب سے زیادہ پُر شکوہ اور قابل فخر و ستائش ہے۔ تقدس کے یہی چشمے فی الجملہ اقدار بن جاتے ہیں ــــ اقدار جو عشق و محبت اور ایثار و قربانی کے شاہ کاروں کو جنم دیتے ہیں جن سے تاریخ عالم معمور ہے اور تمام بنی نوع انسان کے زریں کارناموں اور متاع روحانی پر دلالت کرتے ہیں۔ انسانی اقدار فی الحقیقت احیائی تقدس ہیں اور بلحاظ اطلاق، متنوع ہونے کے باوصف ان کی حیثیت ابدی اور مطلق ہے۔ وہ اسی صورت میں بدل سکتے ہیں کہ نوع انسانی بدل جائے یا صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔

کہا جاتا ہے کہ عظیم فلسفی "نطشے"[1] نے ایک گھوڑے کو فوجی بھرتی سے بچانے کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دی۔ مادہ پرست کا ذہن اس واقعہ کو نہ صرف پاگل پن خیال کرے گا بلکہ ایک المناک اور قابلِ مذمت سانحہ بھی کیونکہ نتیجتاً ایک جانور کی جگہ ایک مرد نابغہ (جینئس)[2] کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن انسان کی حیرت انگیز سرشت میں ایک غیر معمولی عنصر ایسا بھی موجود ہے کہ اس سانحہ کو زریں کارنامہ قرار دیتا ہے اور اس کی ایسی مدح سرائی کرتا ہے جو ایک مقدس شے کے شایانِ شان ہو۔ نیز وہ اس سودے کو جو نطشے نے اپنی جان کے عوض کیا ہے، بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ اس طرح ایک قدر کی آفرینش ہوئی ہے یعنی اخلاقی قدر کی آفرینش جو ایک جسم کے مقابلہ میں، خواہ وہ جسم کسی جینئس ہی کا کیوں نہ ہو ایک وجودی قدر کی حیثیت سے بہت ہی بلند تر ہے۔

انسان کے اندر اس قسم کا محرکہ یا صوابدید، وجود انسانی کی اس ماورائی جہت سے پیدا ہوتا ہے جس کی نفی سے انسان کی نفی اور جس کے اثبات سے خود مادیت کی نفی ہو جاتی ہے۔

۱؎ NIETZSCHE

۲؎ GENIUS

فاجعاتِ نو[۱]

فاجعاتِ نو جو انسانیت کے انحطاط اور اس کو مسخ کر دینے کے ذمہ دار ہیں، انہیں من حیث المجموع دو عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو معاشرتی نظام، اور دوسرا افکار کا نظام۔

موجودہ دور کے دو معاشرتی نظام بظاہر تو ایک دوسرے کے مخالف دکھائی دیتے ہیں اور دورِ جدید کا انسان ان میں سے ایک یا دوسرے سے وابستہ ہے ہی اور اگر نہیں ہے تو وہ ہر شخص کو اپنے سے اس سے وابستہ ہو جانے کی دعوت دیتے ہیں لیکن صریحی طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ہی انسان کی اصالت اور اس کی ماورائے مادہ حیثیت کو بڑے افسوس ناک طریقہ سے فراموش کر دیتے ہیں چنانچہ سرمایہ داری اور کمیونزم باعتبار ہیئت تو بادی النظر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن دونوں کے دونوں انسان کو ایک معاشی حیوان گردانتے ہیں اور ان کی ساخت کے پیچ و خم میں فرق ہے تو یہی کہ اس حیوان کی احتیاجات کون بہتر طور پر پوری کر سکتا ہے۔

مغرب کے سرمایہ دارانہ صنعتی معاشرہ کے فلسفۂ حیات کا بنیادی اصول تو "اقتصادیت"

۱؎ یہ بھی علی شریعتی کی اصطلاح ہے جس کو ہم نے برقرار رکھا ہے۔ انگریزی میں اس کا مفہوم (CALAMITIES) سے ادا ہوتا ہے ویسے اس باب کے ابتدائی حصہ میں مصنف نے خود ہی اس اصطلاح کی تشریح کر کے مفہوم واضح کر دیا ہے۔ (مترجم)

ہے جہاں بقول فرانسس بیکن[1] سائنس حق کی تلاش کر کے اقتدار کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔"

آئے دن مادی احتیاجات کی افراط جو متواتر روز افزوں ہے لوگوں کی قلب ماہیت کر کے انہیں شاہ خرچ صارفین بنا کر رکھ دیتی ہے تاکہ اشیائے مصرف کی مادی پیداوار کا دائرہ کیفی، کمی اور نوعی ہر اعتبار سے وسعت پذیر ہوتا جائے اور کارخانوں کے بے پناہ انجنوں کا دوزخ بھر سکے جہاں ایک دوڑ ہے کہ دیوانہ وار جاری ہے۔ یوں تو خود لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اشیا خریدنے کا سودا سمایا ہوا ہے۔ پھر مصرف[2] کے نئے نئے راستوں کی تلاش کا بھاری سے بھاری بوجھ اس پر مستزاد، اس کے نتیجہ میں جدید فنی عجوبہ کاریاں جنہیں انسانیت کو جسمانی محنت کی غلامی سے نجات دلا کر لوگوں کے اوقاتِ فرصت میں اضافہ کرنا چاہیے، اتنا بھی کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ مادی ضروریات کی اس طرح پیدا کردہ مصنوعی مانگ میں اس حد تک اضافہ ہو رہا ہے کہ پیدائش دولت کی ٹیکنالوجی کی زبردست ترقی کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ انسانیت ہر روز اسی جنون کا شکار رہتی ہے اور چار و ناچار اس اندھا دھند دوڑ کے گرداب میں غرق ہو جاتی ہے یہاں نہیں کہ انسان، اخلاقی اقدار و فضائل اور روحانی مدارج کی نشو و نما کے لئے فارغ نہیں بلکہ ہر دم اس پر اشیائے مایحتاج کیلئے تلاش برائے مصرف اور مصرف برائے تلاش کی دھن سوار رہتی ہے۔ پھر تعیشات و تفریحات کے سلسلہ میں دیوانہ وار مسابقت کا وہ بازار گرم رہتا ہے کہ روایتی اخلاقی قدریں مائل بہ انحطاط ہوتے ہوتے محو

---

[1] FRANCIS BACON

[2] CONSUMPTION کے لئے علی شریعتی نے مصرف ہی استعمال کیا ہے لہٰذا اس کے مزید ترجمہ کی کوشش نہیں کی گئی ہے یہی لفظ آگے بھی متعدد جگہوں میں آیا ہے اور جوں کا توں برقرار ہے۔ (مترجم)

ہو جاتی ہیں۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کمیونسٹ معاشرہ میں بھی اخلاقی قدروں کے انحطاط کا یہی میلان پایا جاتا ہے۔ بہت سارے مفکرین، کمیونسٹ معاشرہ اور سرمایہ دارانہ معاشرہ پر غور و فکر کرتے وقت معاشی و سیاسی اعتبار سے ان کے باہم مغایر پہلوؤں کو فلسفہ حیات، انسیات اور علم البشر کے نقاط نگاہ میں اختلاف سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل واضح ہے کہ کمیونسٹ معاشرے بھی، اجتماعی کردار، اجتماعی نفسیات، نیز انفرادی زاویہ نگاہ اور فلسفہ حیات و فلسفہ طبع انسانی کی حد تک، مغربیت کے بورژوائی معاشروں سے قریبی مماثلت رکھتے ہیں، ہر چند کہ معاشی ترقی کے لحاظ سے وہ قدرے بلند سطح پر ہیں۔ آج کل کے کمیونسٹ معاشروں میں در اصل، رسمی آداب زندگی حتیٰ کہ لبرل طرز زندگی کے نام پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ مغربی دنیا کے ہم عصر باشندوں کے طرز بود و باش کی جانب جھکاؤ کے سوا کچھ نہیں۔ علاوہ بریں کیا نجی طور پر اور کیا ملکی سطح پر پیدائش دولت کے نظام میں فیشن پرستی اور تعیشات کو جس شدت کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس کا اصل سبب اس واقعہ میں مضمر ہے کہ کلی اعتبار سے بھی اور حتمی تجزیہ میں بھی دونوں کے دونوں نظام، تاریخ انسانیت کے بازار میں بالکل ایک سے انسان فروخت کیلئے پیش کرتے ہیں۔

جمہوریت اور مغربی لبرل مکتب کے ساتھ جیسا کچھ بھی تقدس وابستہ ہو، عملی زندگی میں بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ کھلے بندوں ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں جن سے فیشن پرستی اور تعیشات کی نمائش کے جذبہ کو اور تقویت پہنچے، نیز نفع اندوزی کی خاطر اپنا منہ کھولے بیٹھی ہوئی ان طاقتوں کے مابین سخت مسابقت کے تحت جلد ہی ایک میدان مہیا کر دیں جو انسانوں کو معاشی حیوان کا روپ دے دے اور انہیں خرچ کا رسیا بنا دینے

پر مامور ہیں۔

بہر حال ہمارے سامنے ایک تو سرمایہ دارانہ حکومت ہے اشتراکیت کے نام پر، دوسرے آمریت ہے، پرولتاریت کے نام پر، پھر ذہنوں پر حکومت ہے یک جماعتی معاشرہ کے نام سے، نیز مذہبی جنون ہے، مذہبی عقائد کی پابندی کے نام سے اور آخر میں میکانیت اور اقتصادیت ہے جس پر تکیہ کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ جلد از جلد معاشی فراوانی کا حصول اشتراکیت سے کمیونزم کی جانب لے جانے والی راہ ہموار کرے۔ یہ سارے کے سارے وہ بارہائے گراں ہیں جو تقدس، آزاد اور تخلیقی ارادہ کے نام پر بنی نوع انسان کے سر تھوپے گئے ہیں اور یہی انسان کو معاشرہ کے ہاتھوں ایک "اجتماعی شے" کے طور پر یعنی سماج کے سانچہ میں ڈھلا ہوا پتلا بنا دیتے ہیں جو نامکمل سہی لیکن جس میں ہر چیز کی عکاسی اور رسائی ہو جائے ــــ گویا سیاسی اور فکری بیگانگی کی وہی حالت زار کہ بورژوائی انسان کے تعلق سے بھی مارکس اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

عصر حاضر کے فاجعات کی دوسری صنف نظریاتی سطح پر تباہ کاریوں کی ہے یہاں ہم نے نظریاتی کی اصطلاح بہت ہی وسیع معنوں میں استعمال کی ہے چنانچہ موجودہ دور کے بہت سارے نظریات، عصری سائنس پر مبنی ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن سب کے سب انسان کی اصالت سے انکار کر دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی جو انسیات کے بارے میں بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔

تاریخیت، تاریخ کو اس طرح پیش کرتی ہے گویا اس مادی رخ کو متعین کرنے والی واحد قوت ہے جو اپنے عمل کے دوران اور تاریخی عمل کے اٹل قوانین کے مطابق نیز مادی عناصر ہی سے ایک ایسی شے تعمیر کر رہی ہو جسے انسان کہا جاتا ہے۔ اس طرح تاریخیت بھی اسی

مادی جبریت کی طرف رہبری کرتی ہے جس میں انسان کی حیثیت ایک انفعالی عنصر کی رہ جاتی ہے۔

حیاتیات، قوانین فطرت کو مرجع خیال کرتی ہے اور انسان کو ایک حیوان کا درجہ دیتی ہے۔ البتہ انسان کو سلسلۂ ارتقا کی سب سے آخری کڑی سمجھا جاتا ہے مگر انسان کی تمام روحانی شئون و تجلیات نیز منفرد خصوصیات کو محض اس کی جسمانی ساخت سے منسوب کر دیتی ہے یعنی جبلتیں، !

عمرانیات، انسان کو ایک پودا خیال کرتی ہے جو اپنے عمرانی ماحول کے باغ میں نمو پذیر ہو۔ لہٰذا اس کو ایک مخصوص سرزمین اور آب و ہوا درکار ہے چنانچہ اس کا ماحول بدلے گا تو ان پودوں کی فصل بھی بدلے گی لیکن تبدیلی کا یہ عمل بہر صورت میں سائنس کے قوانین ہی کا تابع ہوگا جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں یعنی وہ قوانین جو انسانی شخصیت اور اس کی ساخت و پرداخت پر حاوی ہیں۔

اگر ان مکتب ہائے فکر کے ساتھ ہم مادیت اور فطرتیت کو بھی شامل کریں جو انسان کو بالترتیب ایک مادی شئے اور حیوان کا درجہ دیتے ہیں تو نظریاتی سطح پر عصر حاضر کے فاجعات کا اچھا خاصا خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔

اس خصوص میں مارکسیت کا معاملہ بڑا ہی ژولیدہ ہے۔ مارکسیت کے متعدد پہلوؤں میں سے ایک رخ مادیت بھی ہے لہٰذا وہ کسی حالت میں بھی انسان کی ہستی کو عالم مادی کے ایک عنصر سے زیادہ ماننے کے موقف میں نہیں۔ ڈاروِن[1] کے تحقیقاتی کاموں کا مطالعہ کرنے کے بعد مارکس نے اینجلز[2] کو لکھا تھا کہ " اس نقطۂ نگاہ کو میں اپنے فلسفہ تاریخ کی حیاتیاتی

---

[1] DARWIN [2] ENGLES

بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کئے لیتا ہوں۔

مارکس کا دوسرا رخ وہ ہے جہاں وہ اجتماعیت کی بدرجۂ اتم حمایت کرنے والوں میں شامل ہے، اس طرح وہ معاشرہ کو فطری اور بشری رجحانات کے علی الرغم آزادی دینے کو تیار ہے پھر حکیمانہ انداز میں اور پورے وثوق کے ساتھ اس کے متعدد عناصر کی گروہ بندی معاشرہ کے زیریں اور بالائی ڈھانچوں میں کر دیتا ہے۔ اوّل الذکر سے تو مادّی دولت کی پیدائش کے طریقوں اور مابعد الذکر سے ثقافت، اخلاق، فلسفہ، ادب، آرٹ اور نظریات وغیرہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہ انسان کو محض نفسہ اس بالائی ڈھانچہ کا ہمسر بنا کر پیش کرتا ہے یعنی یہ کہ انسان ان اجزاء کے مجموعہ کے سوا کچھ نہیں۔ قصہ مختصر بنی نوع انسان مادّی دولت کی پیدائش کے طریقوں ہی کی پیداوار بن کر رہ جاتے ہیں چونکہ مارکس پیدائش دولت کے طریقوں کو بھی آلات و اوزار پیدائش کے ساتھ مخصوص خیال کرتا ہے لہذا مارکسیت کے مختتم تجزیہ میں بنی نوع انسان کی اصالت کو انہی اوزار کی اصالت سے ماخوذ سمجھنا چاہیئے۔ یہ گویا 'انسیات' نہیں ظروفیت ہے! یا یوں کہیئے کہ بنی نوع انسان جیسا کہ اسلام کا خیال ہے آدم کی اولاد نہیں بلکہ آلات و اوزار کے زائیدہ ہیں۔

مادّیت کے ساتھ جدلیات کو منسلک کر کے مارکس نہ صرف انسانیت کے سر سے تاج عظمت چھین لیتا ہے بلکہ انسان کے اندر تاریخی جبریت کے شانہ بشانہ مادّی جبریت ایک اور قوت نافذ العمل کر دیتا ہے پھر عملاً اس کا اطلاق جبریت کے ایک نئے سلسلہ منتج ہوتا ہے، کیونکہ واقعتہً اس کے باعث انسان کا اختیار طوق و سلاسل کا پابند ہو جاتا ــــ اختیار جو کائنات میں انسان کی اصالت کا سرچشمہ ہے ــــ اسی پر اکتفا نہ ہوئے وہ انسانیت کو آخر کار تقدیر پرستی کے اسی قعر میں لا پھینکتا ہے جسے نوم رجیانؔ

مذہبی تعلیمات کے علمبرداروں بلکہ صحیح معنوں میں ان فلاسفہ اور ماہرین الہیات نے کھود رکھا ہے جو سیاسی پشت پناہی پر تکیہ کئے رہتے ہیں۔

غرضکہ جبریت کا سلسلہ تو ایک ہی ہے اور ہمیشہ سے وہی ہے البتہ اس کا آخری سراب آسمان سے نہیں بلکہ زمین سے منسلک ہے پس یہ کوئی اتہام نہیں اگر ایسی مادیت کو مادیت کے جنون کا نام دیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کو آج سب سے بڑی اور جس اولین تباہی کا سامنا ہے وہ "انسان کی تباہی" ہے۔ آج کا انسان باعتبار نوع زوال آمادہ اور مسخ ہونے اور خشل پروانہ خود اپنی کاوشوں اور سرگرمیوں کی بھینٹ چڑھنے کو ہے۔

پھر حیران کن بات یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں وہ اپنی نجات ہی کے تصور پر قربان ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کو بار بار الٹ کر دیکھئے تو نجات ہی کی خواہش رہ رہ کر کروٹیں لیتی پھر انسانیت کو اسیری کی زنجیروں میں جکڑتی اور امید رہائی دلا کر گرفتار قفس کرتی رہی ہے۔

مذہب جو کہ بیک وقت عشق کی زبردست قوت بھی ہے اور کمال ونجات کے لئے ایک دعوت ازل کے چشمہ شفاف سے پھوٹ کر جادۂ تاریخ پر بہتا ہوا، اپنے رنگ و بو اور اثر آفرینی کی کیفیات کھو چکا ہے۔ اس کے بہاؤ پر اب انہی طاقتوں کا قبضہ ہے جن کے سروں پر تاریخ کا تاج رہا ہے اور "زمان اجتماعی" کی زمام اقتدار جن کے ہاتھوں میں رہی ہے۔

چنانچہ چین میں لاؤتسو[1] کے مکتب کا آغاز دعوت نجات ہی کی حیثیت میں ہوا۔

---

1. LAO TZU

نجات اس مصنوعی زندگی سے، نجات اس عقل نارسا سے، نجات اس تمدن خام سے۔ جس نے راستباز آدمی کو بندشوں میں مقید کر کے انسان کی ازلی سرشت کو جو کہ ناموس فطرت یعنی "تاؤ"[1] کے ساتھ ہم آہنگ ہے، منحرف و آلودہ کر رکھا ہے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ہوا یہ کہ "تاؤمت" کے مذہب میں بے شمار خداؤں کی عبادت ہونے لگی ـــ ان خداؤں کی جو بنی نوع انسان کا معاشی استحصال اور ان کے قوائے ذہنی کو مفلوج کرتے رہے اور جن کی وجہ سے انسانیت کو طرح طرح کے خوف و خطر سے دوچار ہونا پڑا۔

کنفیوشس[2] بھی انہی موہوم طاقتوں کی اسیری سے بنی نوع انسان کو چھڑانے کے لئے توہمات کے خلاف برسر پیکار ہوتا رہا۔ اس نے اوہام باطل، قربانی کے مسلسل رواج، نذر و نیاز، ریاضت پیہم اور نفس کشی کے دلدل سے نکال کر انسانیت کا رخ تاریخ، معاشرہ زندگی اور عقل کی جانب موڑ دیا نیز اجتماعی زندگی کے لئے ایک منطقی و عقلی اساس جسے وہ (ا ے۔ لائی)[3] کی اصطلاح سے یاد کرتا ہے، مہیا کر دی لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ بنیادی اصول اٹل اور ناقابل تغیر رسم و رواج میں ڈھل گئے، یہاں تک کہ معاشرتی اصلاح اور تبدیلی کی ہر کوشش ملیا میٹ کر دی گئی۔ لوگ اپنے ماحول میں مست اس طرح گزر بسر کرنے لگے گویا برف سے ڈھکے ہوئے قطبین کے جانور ـــ پھر تو ان پر ایک جمود طاری تھا قدرت پرستی کا جنون۔ چنانچہ ایک ماہر عمرانیات کہتا ہے:۔

"اگر ہم چین کے معاشرہ اور تمدن کی تاریخ کا پچھلے ڈھائی ہزار سال سے مطالعہ

---

[1] TAO   [2] CONFUCIUS

[3] دراصل (ر ا) "لکھنا چاہیے" کی جگہ (ا ے) لکھ دیا ہے جو غالباً "معاذ" کے معنوں میں ہے اور سہواً الٹ گیا ہے۔ (مترجم)

کریں تو اس طویل عرصہ میں نہ کوئی ترقی دکھائی دیتی ہے اور نہ کسی نشیب و فراز کا وجود ہے اور نہ ہی بالکلیہ زوال و انحطاط ۔ وجہ اس کی ہے تقدیر پرست اور روایت پسند کنفیوشی ذہن کی حکمرانی ؛

ہندومت کہ انسان کے تعلق سے واضح عرفان کے دوش بدوش خدا ، کائنات اور انسان کی وحدت کے بارے میں بھی گہری سوجھ بوجھ رکھتا ہے ۔۔۔ ایسی سوجھ بوجھ کہ اس جہان بے ثبات کے جسم میں روح تازہ پھونک دے اور ذہن انسانی کی تصعید کے لئے ایک طاقت بن جائے ۔۔۔ توہمات کا ایک ہولناک ہجوم بن گیا جس میں بے شمار خداؤں کا انبوہ کثیر لوگوں کے سر پر مسلط ہے ۔ پھر یہ خدا بے چارے بندوں کے حلق کا نوالہ تک چھین لیتے ہیں اور نجات (یعنی مکتی) کا پیام دینے والوں اور مشرق کے بلند تر تصوف (ودیا) کا پرچار کرنے والوں کو توہم پرستانہ اور جان لیوا تپسیا اور ذلت آمیز پوجا پاٹ کی لگن میں مبتلا کر کے رسمی طور پر سلسلہ پروہتوں اور گیانیوں کے چیلے بنا دیتے ہیں ۔

لہٰذا ہندوؤں کو اس سے نجات دلانے کے لئے بدھ مت آتا ہے ۔ مہاتما بدھ نے آسمانی خداؤں کی بندگی سے یک لخت آزادی دلانی چاہی لیکن ان کے پیروؤں نے خود مہاتما بدھ کی پرستش شروع کر دی ۔ اس حد تک کہ فارسی میں "بت" کا لفظ جو 'بدھ' سے ماخوذ ہے "بت پرستی" کی اصطلاح کا جزو اور شرک کی انتہائی شکل کا مترادف بن گیا ۔

حضرت مسیح موعود یعنی وہ نجات دہندہ جنہیں انسانیت کو مادیت اور یہودی ملاؤں کے چنگل سے آزاد کرانا تھا ، مذہب کو اسرائیلی نسل پرستوں اور سوداگروں کی گرفت سے رستگاری دلانی تھی نیز صلح آشتی کا بول بالا کر کے روح انسانی کے لئے وجہ نجات بننا تھا تو انہوں نے چاہا کہ فریسیوں اور یہودی ربیوں کے توہمات کا طلسم توڑ دیں ۔ نیز قیصر روم کے استبداد

اور قہاری کا پردہ چاک کردیں تاکہ لوگ آزادی و اطمینان کا سانس لے سکیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت خود قیصرِ روم کے تخت کی وارث بن گئی اور کلیسائے روم نے اس شہنشاہی نظام کو دوام بخش دیا۔ پھر مدرسی فلاسفہ[1] نے قرونِ وسطٰے کے جاگیرداری نظام کو عقلی جواز کا جامہ پہنا دیا اور حریتِ فکر کو کچل کر آزاد ذہنی ارتقا اور علم کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا۔ ہماری آنکھوں نے پھر یہ بھی دیکھا کہ اس صلح کل مذہب نے خون کی ندیاں بہائیں کہ تاریخ میں اس سے قبل شاید ہی اتنا خون بہا ہوگا۔ انسان جسے اخلاقی و روحانی معنوں میں "خدا صفت" بن جانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس خدا، انسان صفت" بن کر رہ گیا۔

اور اب آخر میں اسلام یعنی تاریخی مذاہب کی آخری کڑی جو توحید اور فلاح کے نام پر شروع ہوا تاکہ پوری انسانیت کو "پستی زمین" سے نکال کر علوئے آسمان کی طرف، بندوں کی بندگی سے چھٹکارا دلاکر الٰہ العالمین کی بندگی کی طرف، اور مذاہب کے ظلم سے بچا کر عدل اسلام کی طرف بلائے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ دعوت کس طرح تبدیل ہوتی چلی گئی اور رفتہ رفتہ مسلمان "تقدیر" کے اسیر ہوگئے اب فلاح کا راستہ توحید، عمل صالح، تقویٰ اور علم کا راستہ نہ تھا بلکہ موروثی روایات اور اندھی تقلید نیز نذر و نیاز اور توسل ہی اس کا ذریعہ بن گئے اور حقائق اور معاشرہ اور دنیوی زندگی سے عالم ملکوت کی سمت فرار و گریز کا نام فلاح رکھ دیا گیا۔ گویا اصل نجات عبارت تھی فطری خواہشات اور بشری احتیاجات کا گلا گھونٹنے نیز انسانیت کی تاریخ و ترقی اور دنیوی زندگی میں فلاح و فوز کے بارے میں یاس و

---

[1] SCHOLASTIC PHILOSOPHER (اسکولاسٹک)

نا امیدی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اجتماعی اور سائنٹفک ترقی میں بری طرح حائل تھا کیونکہ بنی نوع انسان کے ارادوں، اذہان اور افکار کے غنچہ ہائے ناشگفتہ کے کھلنے اور پھلنے پھولنے پر تو بندش عائد تھی لیکن رسمی طریقوں اور سماج کے عاید کردہ قیود نیز توہمات کو خوب فروغ تھا اور سب کچھ تقدیر کے ان متولیوں اور محافظوں کی سرپرستی میں ہو رہا تھا جو رسمی ضرور پہ مامور تھے اور جن میں کلیسا اور پوپ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایسے میں نشاۃ ثانیہ جس کو اہلِ فکر کی تحریک نہیں بلکہ معاشرہ کے حرکی عناصر کا تلاطم کہنا چاہیے، منصہ شہود پر نمودار ہوتی ہے اور قرونِ وسطیٰ میں متولیانِ مذہب کی سرپرستی سے پیدا شدہ جمود کا مقابلہ یونان و روم کے درخشاں دور کے ساتھ کرتے ہوئے لوگوں کو قومیت کے نام پر آزادی کی دعوت دیتی اور پاپائیت کے لاطینی سامراج نیز توہمات اور جمود پر مبنی کیتھولکی علم کلام کے برخلاف ساری انسانیت کے لئے علم کے دروازے کھول دیتی ہے۔

لیکن نعرے کیا تھے؟ عالم بالا کے "جبری ارادہ" کی قید سے انسان کی رہائی، دینی عقائد کے محکمات سے عقل کی رہائی، علم کلام کے تحکماتی اسلوب سے علم کی رہائی اور آسمان سے زمین کی جانب بازگشت تاکہ ہمیں اس روئے زمین پر اس بہشت کی بنا ڈالی جائے جس کا وعدہ ہے آخرت میں!

کتنے دل خوش کن نعرے ہیں! عقل کی آزادی، علم کی رہبری و رہنمائی اور جنت بھی نقد! لیکن اس ارضی جنت کی تعمیر کرنے والے ہاتھ کون سے ہوں گے؟ نوآبادیاتی نظام اور استحصال کا شکار انسانیت، سائنس اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر یعنی سائنس

دور سر علیہ!

گویا مذہب کی خدمت سے تو علم آزاد ہوا لیکن اقتدار کا خادم اور صاحب اقتدار کا تابع مہمل بن گیا اب وہ تنگ نظر و جامد "سائنسیت"[1] کے قالب میں بندۂ قیصر تھا اور مسیح کا قاتل!

مشین؛ مشین جس کو انسان کے ہاتھوں میں ایک آلہ کار بن کر اُسے فطرت پر حکمران اور محنت و مشقت سے چھٹکارا دلانا تھا۔ ایک ایسے میکانکی نظام میں تبدیل ہو گئی جس نے انسانیت کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا۔ اور اس جنت ارضی کا دربان، یعنی سرمایہ داری استبدادی سائنس اور ٹیکنالوجی سے مسلح ہو کر ایک نیا جادوگر بن گئی جس نے میکانیت، ٹیکنالوجی اور بیوروکریسی کے بے رحم اور سنگین پہیوں تلے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا۔

اور انسان؛ ایک معاشی حیوان کہ اس بہشت میں چرتا ہی رہے۔ یعنی فلسفہ مصرف و مصرف!

مسلک؛ لبرل پرستی یعنی بے حسی!

جمہوریت؛ ان کا انتخاب جو تمہاری تقدیر کا پہلے ہی سے انتخاب کر چکے ہوں!

زندگی؛ مادی

اخلاقیات؛ ابن الوقتی اور خود پرستی!

نصب العین حیات؛ مصرف!

فلسفۂ حیات؛ طبعی احتیاجات کی تکمیل!

مقصدِ حیات؛ فراغت و عیش کوشی!

ایمان؟ آیڈیل؟ عشق؟ معنیِ وجود؟ مفہوم انسان؟..... چھوڑو اس قصہ کو!

---

[1] SCIENTICISM

باز نہ آدم خاکی اس جنت ارضی میں بھی معصیت سے باز نہ رہ سکا:

مارکسیت

سرمایہ داری کی نفی، طبقات کی نفی، استحصال کی نفی، ملکیت کی نفی، اختصاص کی نفی، زراندوزی کی نفی، اخلاقیات میں منفعت طلبی کی نفی ...... اور سب سے بڑھ کر اس نظام معاشری و نظام پیدائش دولت کی نفی جو انسان کی اصل حقیقت کو مسخ کرکے اس کو اپنا اسیر بنالے۔

چہ خوب! ایک ایسا معاشرہ کہ "ہر شخص کو اس کے کام کی مناسبت سے نہیں بلکہ ہر شخص کو اس کی ضرورت" کے اصول پر جس کی تعمیر ہو!

اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب ہے تمام انسانوں کی مکمل مساوات! یعنی ہر شخص کو اس کا حق ملتا ہے حتیٰ کہ ایک مکمل معاشرہ کے قیام کا وعدہ جس میں ہر شخص کو اس سے زیادہ ملے جو اسے ملنا چاہیئے!

ایک خواب! ایک خیالی جنت (یعنی یوٹوپیا[1]) لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ حرفِ نفی بے چارے مذہب کی طرف سے نہیں جو بہشت کی باتیں کرتا ہے نہ اس فلسفہ کی طرف سے جو "نیکیوں کے شہر" کی داغ بیل کا دعویدار ہے حتیٰ کہ ایک تصوریت پسند یا اخلاقیات کا درس دینے والی اشتراکیت اور یوٹوپیا کے قائل کی طرف سے بھی نہیں، بلکہ یہاں معاملہ تو آپڑا ہے "سائنس پر مبنی فلسفہ" سے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ہاتھ ہوں گے جو اس مثالی (آئیڈیل) معاشرہ کی تعمیر کریں گے؟ سچ تو یہ ہے کہ "تعمیر کریں گے" نہیں بلکہ "تعمیر ہونگے" کہنا چاہیئے کیونکہ تاریخ کے جبری قوانین کا انکشاف اسے جبری تحقق بخشے گا! یعنی ان قوانین کے انکشاف کی بدولت

---

[1] UTOPIA

یہ مژدہ بھی مل رہا ہے کہ اس کی تعمیر ناگزیر ہے! وہ مزدور جو نظام سرمایہ داری کے ہاتھوں اپنی بساط سے بڑھ کر فقر و فاقہ اور استحصال کا شکار رہے ہیں، وہ اہلِ دانش جو بورژوائی جنت کے خلاف آمادہ بغاوت ہیں اور وہ اہلِ فکر جو انسان کی مکمل آزادی کے آرزو مند ہیں، آخر ان سب کو کس کی جستجو ہے؟

لہٰذا ایک مرتبہ پھر، ہم ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جس میں حکمت کا تصور محو ہونے کی بجائے پرولتاریت کی آمریت! آزاد معاشرہ اور روزگار کے آزاد مواقع کے بجائے ایک ایسا معاشرہ جو سراپا منصوبہ بندی کا مرہونِ منت اور جس میں ہر فرد کے لئے ایک مخصوص و معین فرضِ منصبی! میکانیت کا قلع قمع تو ایک طرف، اُلٹے ایک زود تر صنعتی انقلاب جو خود ہی سرمایہ داری کے میکانی فلسفہ پر مبنی ہو! بورژوائی بیوروکریسی کی بندشوں سے فرد کی رہائی کے بجائے، فرد حکومت کی مرکزی بیوروکریسی کا اسیر! سرمایہ داری کے توسیع پسندانہ عزائم کے نتیجہ میں بڑھتے ہوئے استحصال کا خاتمہ نہیں بلکہ حکومت کے توسیع پسندانہ منصوبوں کی خاطر استحصال! سرمایہ دارانہ معیشت کے استحصالی اداروں کی گرفت سے فرد کی گلوخلاصی کے بجائے شدید تر منظم معاشرہ کا شکنجہ! انسان کی آزادی میں اضافہ کی جگہ اخلاقیات، ثقافت اور معاشرہ کو ایک مخصوص قالب میں ڈھالنے کی کوشش! کلیسا کی بندگی اور کورانہ تقلید سے چھٹکارا دلانے کی بجائے نظریہ ساز کمیٹیوں کا اتباع و اطاعت! تاریخی شخصیتوں کا انکار لیکن قائدین کی شخصیت پرستی برابر جاری! نظریاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس پیش پا افتادہ انفرادی مادیت کے ہاتھوں "انسیات" کو جب سے شکست ہوئی ہے انسان اپنے حساس اور خود آگاہ ارادہ سے یعنی ان ملکات عالیہ سے جو صحیح معنوں میں پورے وجود پر حاوی ہوں، محروم ہو چکا ہے۔ گویا مادیت جبریت کی طلسماتی کالک جہرہ جو اندھی کشمکش میں الجھا دیا گیا ہر اور

جدلیاتی مادیت کی غیر ارادی پیداوار جسے اب وہ اپنا مطیع و منقاد بنا چکی ہے۔

جب ہم سرمایہ داری کے رہا شدہ انسان اور مارکسیت کے پابند سلاسل انسان کا تقابل کرتے ہیں یعنی ایک "نام کا انسان" اور دوسرا "مخصوص قالب میں ڈھلا ہوا انسان"! تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں میں کس کا حال زیادہ ابتر ہے؟

وجودیت[۱]

"وجودیت" ان ہر دو کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے۔ انسان دوست مفکرین نے جو ہمیشہ سے انسان کی آزادی و خود مختاری کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی ہی سے اور بالخصوص انیسویں صدی میں سرمایہ داری اور میکانیت کی غیر انسانی خصوصیات کے خطرات کو بھانپ لیا تھا اور ان پر اخلاقی و جمالیاتی نیز سائنس کے تجزیاتی اور منطقی پہلوؤں سے حملہ شروع کر دیا چنانچہ انہی خطوط پر کام کرتے ہوئے انہوں نے ایک جاندار اور قیمتی ادبی سرمایہ مہیا کر دیا جس سے خود مارکسیت بھرپور طریقہ پر فیضیاب ہوتی رہی، یہاں تک کہ ریمنڈ آرون[۲] کے الفاظ میں "مارکسیت کی حقیقت اس سے بڑھ کر نہیں کہ غیر مارکسی مفکرین نے جو کچھ کہہ دیا تھا بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس کی تالیف و تدوین کا نام مارکسیت ہے"۔

یہاں جو بات باعث دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تابناک کامیابیوں اور ان کے طفیل میں یورپ کے پھلتے پھولتے تمدن کے باوصف جو اس دور کا سب سے ترقی یافتہ تمدن ہے، "روح انسانی بڑے شد و مد سے اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے لہٰذا انسان دوست مفکرین کے نزدیک اس کو للکارنا اور دعوت مبارزت دینا ہی وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔"

۱: EXISTENTIALISM   ۲: RAYMOND ARON

سرمایہ عامل پیدائش ہے، سرمایہ اشیا کی قدر کا تعین کرتا ہے اور سرمایہ ضابطہ حق بھی ہے لیکن محنت جو انسان کی ممتاز ترین شان وجود ہے وہ سرمایہ کی کنیز ہے! کیا ستم ظریفی ہے؟

گویا سرمایہ اس دور کا سب سے بڑا بت ہے! انسان اس کے سامنے ہیچ و پوچ! یعنی اپنے آپ سے بیگانہ، محض سرمایہ کا غلام اور اس کا دیوانہ!

اس کے برعکس انسان کا دوسرا تجزیہ؛ عملاً وہ بھی تلخ تر اور بدتر ہی ثابت ہوا یعنی مارکسیت کا نظریہ۔ اپنے کمال کو پہنچنے کے پچاس سال بعد غیر متوقع طور پر ایک ایسی سرزمین میں اس کا بیج بویا گیا جسے مارکس خود بھی ہرگز پسند نہ کرتا، جیسا کہ روس کے بارے میں مارکس کی ابتدائی تحریروں سے ظاہر ہے۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے ایک اور بت کھڑا ہے کیونکہ انسان کو تو معاشرہ جنم دیتا ہے اور معاشرہ خود بھی انسانی ذہن اور اقدار اور شعور اور اخلاق اور ثقافت اور اعیان اور احساسات کے روش بدوش عوامل پیدائش کا آفریدہ ہے۔ اور عوامل پیدائش سے مراد ہے مشین!

یہاں اس قدیم شاعر کی حکایت[1] یاد آتی ہے جس نے اپنی محبوبہ سے محض اس لئے قطع تعلق کر لیا کہ اس کی آنکھوں کے جادو کی تاب نہ لاسکا۔ چنانچہ محبوبہ کو فراموش کرنے کی خاطر اس نے باغبانی شروع کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس آسیب کو اپنے نئے مشغلہ

---

[1] آقائے حمیدی شیرازی نے ایک چینی شاعر کا یہ قطعہ بڑی خوبصورتی سے فارسی میں منتقل ہے۔ اگرچہ کوئی حوالہ ماخذ کا نہیں دیا۔ اصل اشعار فارسی:۔

گم ابر زمستانی گزشت

وقت ناز نرگس بیمار شد

شاخہ ہائے نرگس برگل شگفت

دیدم افسوس! چشم یار شد

کے ذریعے بھلا سکے گا لیکن ہوا کیا؟

و زمستانی ہوا رخصت ہوئی　　　نرگس ناز بیدار ہوئی

شاخ در شاخ کلیوں سے پٹی　　　حیف نذر چشم یار بنی ہر کلی

پس جو لوگ میکانیت سے فرار کے درپے تھے مارکسیت کے دامن سے وابستہ ہو گئے جس نے میکانیت کو زبردست حملوں کا نشانہ بنایا تھا لیکن اس نظریہ کے عروج اور کمیونسٹ معاشروں کے اقتدار میں آنے کے بعد وہی لوگ علانیہ طور پر سرمایہ داری سے بھی سنگین تر جبری میکانیت میں گرفتار ہو گئے۔ ہوا یوں کہ "وافر مادی پیداوار" ہی مثالی اشتراکی معاشرہ کے قیام کی اولین شرط قرار پائی، پھر اس "وافر مادی پیداوار" کے لئے اساسی شرط یہ رکھی گئی کہ پورے معاشرے کی طلب مادیت ایک انتہائی ترقی یافتہ صنعتی معاشرہ میں کر دی جائے اور اس کا راستہ خود انہی اصولوں کا پابند تھا جو بقول لینن کے "سرمایہ داری سے اخذ کرنے تھے" یعنی، اختصاص، نیز تحیث، تکنیکی بیوروکریسی اور شخصی نفع طلبی پر مبنی مسابقت۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک ایسے مقتدر ادارہ کا قیام جو تیزی کے ساتھ معاشرہ کے ہر فرد کو اپنے آپ میں ضم کرے اور سب سے اوپر حکمرانوں کی ایک نئی ٹولی جو بیوروکریسی کے چوٹی کے افراد پر مشتمل ہو لیکن ان افراد کا حال خود بھی سرمایہ داروں سے کچھ ہی مختلف۔ ایسے میں کیا یہ کہنا بیجا ہوگا کہ مارکسیت اور مغربی سرمایہ داری ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں؟

انسانیت کی روح آزادی بہرحال اپنے آپ کو ہر قدم پر اجاگر کرتی رہی چنانچہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایشیا اور افریقہ کے عوام نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ جدوجہد ایک جانب تو اپنے ثقافتی ورثہ کے احیاء اور دوسری جانب ماضی سے

ایک جدید رشتہ استوار کرنے نیز ملی و قومی تشخص کے استقرار کی آئینہ دار بھی لہذا مذہب سے برگشتہ، سرمایہ داری کی میکانیت سے دل برداشتہ اور کمیونزم کی ارضِ موعود سے مایوس شدہ نئی نسل نے اب اپنے اظہار کے لئے ایک نور دریچہ تلاش کر لیا اور یہی دراصل "وجودیت" ہے۔ سارتر جس نے اس کی بنیاد رکھی، خود بھی ایک زبردست ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی اس حالتِ زار سے واقف اور اس پر نوحہ کناں تھا۔

سرمایہ داری نے ایک نیا اقتصادی انسان تشکیل دے لیا تھا اور مارکسیت گویا انسان کو اشیائے مادی کی ترتیب یافتہ تشکیل سے زیادہ کوئی مقام دینے کو تیار نہ تھی۔ کیتھولک نظام نے اسے ایک مقتدر حاکم غیبی کی مشیت کا کھلونا بنا رکھا تھا اور جدلیاتی مادیت نے انسان کو ارادہ سے عاری کر کے محض ذرائع پیداوار کے جبری ارتقائی عمل کا نمونہ بنا دیا تھا۔ ان سب کے برخلاف وجودیت نے خود انسان ہی سے ایک خدا تعمیر کر لیا — پُرشکوہ اور حمد و ستائش کا سزاوار —

سارتر کہتا ہے کہ سارے موجودات تو اپنی "حقیقت و ماہیت" کا تعین ہوتے ہی اپنے وجود سے آگاہ ہو جاتے ہیں بجز انسان کے جس کی حقیقت و ماہیت کا تعین اس کے پیکرِ وجود میں آنے کے بعد ہوتا ہے مثلاً یہ تو معلوم ہی ہے کہ ایک درخت یا ایک طوطا وجود میں آنے سے پہلے ہی کیا کچھ ہونے والا ہے لیکن انسان وجود میں تو آجاتا ہے لیکن معلوم نہیں کہ کیا تھا اور کیا کچھ ہو جائے گا۔ وہ خود ہی اپنی تعمیر کرتا ہے اور خود ہی اپنی ماہیت کا انتخاب بھی۔ لہذا وہ نہ تو خدا کا تخلیق کردہ ہے اور نہ فطرت کا اور نہ ہی اجزاء و عوامل پیدائش کا زائیدہ۔ انسان تو خدا ہے جو اپنی آپ تخلیق کرتا ہے۔ پس کلیسا نے اور سرمایہ داری نے اور کمیونزم نے انسان کی جو بے حرمتی کی ہے اس کے بعد انسانی معجزہ کی اس آواز پر لبیک کہنا لازمی تھا اور یہ ایک فطری امر ہے کہ ہمارے دور میں اس کا داعی سارتر جیسی بھاری بھرکم شخصیت کا مالک ہو جو عصر حاضر

کے فلسفیوں میں سب سے طاقتور قلم کا بھی حامل ہو۔ تاہم سارتر اسی تناقض کا شکار ہے جس کا مارکس۔

وہ محنت کشوں اور دانشوروں سے کہتا ہے کہ نظام سرمایہ داری کو نیست و نابود کر دیں اور ایک اشتراکی نظام کی تعمیر کریں یعنی ایک طرف تو وہ انسان کے ارادہ و اختیار، تخیل اور فکر پر تکیہ کرتا ہے اور دوسری جانب ایک ایسے نظام یعنی جدلیاتی مادیت کا پرچار کرتا ہے جس میں انسان کے ان خصائص کو کوئی مقام حاصل نہیں کیونکہ مادی جدلیات کا فلسفہ اس پر مبنی ہے کہ کمیت و کیفیت کی حرکات اور تحول و تبدیلی پہلے سے موجود تضادات ہی کے جبری قوانین کے تابع ہیں اور ان جبری قوانین کو سارے انسانی عمل پر بالادستی حاصل ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں جو سرمایہ داری کی بیخ کنی کرتے اور کمیونزم کو حقیقت کا جامہ پہناتے ہیں ایسی صورت میں مستقبل پر انسان کا اختیار جو فطرت کی پیداوار ہو اور ناگزیر طور پر اس طرح جبری ہو کیا کسی بھی اہمیت کا حامل ہے؟ پھر ایسے میں مسئولیت کیا معنی رکھتی ہے؟

سارتر گویا تخلیق فطرت اور تخلیق آدم پر [illegible] اختیار پیدا کر کے "ثنویت"[1] کا اعتراف کر بیٹھتا ہے۔ یعنی ثنویت کی بنیاد پر کائنات کی حقیقت سے آگہی اور کائنات کی دو جوہروں میں تقسیم۔ غور طلب امر یہ ہے کہ زرتشت کی تاریخی ثنویت اور مانی کی ثنویت ذات نیز اسلام میں انسان کی ثنویت[3]، بھی کچھ انہی خطوط پر قابل توجیہہ ہے۔

لیکن سارتر جو نطشے[2]، ہیگل[4] اور مارکس کے بعد نیز فائر باخ[5] کے دو صدی بعد آنے والوں میں سے ہے۔ اپنے آپ کو نہ تو اس بیسویں صدی کے کسی مذہبی یا روحانی پیشوا کی

---

۲ : NIETZSCHE ۔   ۱ : DUALISM

۳ : HEGEL ۔ اس سے مراد انسان کی شخصیت میں خیر و شر کے دو پہلوؤں میں باہم جنگ ہے۔

حیثیت میں پیش کرتا ہے اور نہ ہی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہ بہرحال مادیت ہی کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی 'وجودیت' مارکسیت کے ایک مکتب کی حیثیت میں جانی پہچانی جائے۔ چنانچہ وجودیت کے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ کر اس کی پیوندکاری مارکسیت کی شاخ پر کر دیتا ہے تاکہ اس کا شمار مارکسیت کے مابعد نہ کہ ماقبل مکاتب میں ہونے لگے۔

کیا ستم ظریفی ہے کہ خداؤں کا دعویدار انسان اپنے وجود کی بلندیوں سے گر کر صحراؤں میں محو حیرت بنا بادیہ گردی کرتا پھرتا ہے ــــ سارتر کی اعلیٰ و ارفع" وجودیت' کے بام عروج سے اس مقام اسفل کی طرف سقوط کا یہ تماشہ بھی دیدنی ہے جو اس کا نقطۂ آغاز ہے۔

اب اس کو کیا کہا جائے؟ 'مادی جدلیات' یا 'ثنویت'؟ مادیت تو ایک 'مادی توحید' ہے۔ آخر اس توحید میں ثنویت، کیونکر داخل ہو گئی؟ یعنی انسان اور کائنات کی دوگانہ تقسیم کہاں سے آ گئی؟

مارکس کا خیال ہے کہ انسان کے اعلیٰ ترین خصائل اور پاکیزہ ترین آئیڈیل بھی مادی اغراض و عوامل پیدائش ہی کے مقتضیات میں اور انہی کے آفریدہ ہیں لیکن اس کے برخلاف سارتر کہتا ہے کہ اگر ایک فرد شکم مادر ہی سے مفلوج پیدا ہوا ہو تو یہ اس کی بدبختی ہے اور اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہے۔ کیا ہی اعلیٰ تصور ہے!

خود مارکسیت کے پیروؤں کے پاس اس کی کیا توجیہہ ہے؟ یعنی اس سوال کا کہ ایک مافوق الفطرت اور مافوق المادہ ارادہ جو معاشرہ کے ماحول پر قدرت رکھتا ہو حتیٰ کہ انسان کی ساخت و پرداخت پر بھی حاوی ہو، اس کا سرچشمہ کہاں ہے۔ تو ایک مادی کے ہاں اس کا کیا جواب ہے؟ کیا مادہ نے خود ہی ایک غیر مادی وجود کی تخلیق کر دی ہے؟ اس کا جواب اگر "معجزہ" کے اثبات میں ہو تو لامحالہ ایسا جواب مادیت کی عین ضد ہوگا اور ایک

خدائے غیبی کے ہاتھوں کائنات کی تخلیق پر اعتقاد کے مترادف ہوگا۔

تاہم اس مرحلہ پر سارتر کی "وجودیت" میں فلسفہ کی بنیاد پر کسی معقول حل کا فقدان ہی اس کی اصل مشکل نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جو دقت حائل ہے وہ "انسانی عمل" کا وہ محور ہے جس کے گرد یہ مکتب فکر گھومتا ہے اور ٹھیک اسی مقام پر پہنچ کر وہ ڈگمگانے لگتا ہے۔ اگر بات یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے عمل ہی کے ذریعہ بناتا اور بگاڑتا ہے تو اپنے عمل سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا نام "انتخاب" ہے؟ لیکن اس کا مطلب؟ کیا انسان کا وہ آزاد ارادہ جس کا سرچشمہ کوئی بھی خارجی جبری عامل نہیں (خواہ مادی ہو یا الٰہی) اس کا رشتہ ایک مستقل علتِ اولیٰ سے جڑا ہوا ہے؟ یہاں آکر اس دقت سے فلیع فلسفہ کے سارتر اس کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ مادی کائنات میں یہ مابعد الطبیعی ارادہ کہاں سے نمودار ہوگیا اور یہ مادی جدلیات میں خود بخود کہاں سے داخل ہوگیا، ایک اہم تر بلکہ اساسی دقت، عقدۂ لاینحل بن کر حائل ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انتخاب، خواہ کتنا ہی آزاد اور مستقل حیثیت رکھتا ہو وہ کسی نہ کسی معیار کا حامل ہوگا اور اقدار کی اساس پر ہی اس کی صورت گری ہوگی۔ گویا ہم یہاں پھر سے "خیر و شر" یا "اخلاق" کی اسی قدیم بحث میں الجھ جاتے ہیں اور ہر چند کہ سارتر اس سے بخوبی واقف ہے۔ صاف اپنا دامن بچاتے ہوئے استفہامی انداز میں اس کی توجیہ کرتا ہوا گزر جاتا ہے کہ "شر کہاں ہے"؟ اور "خیر کس چیز کا نام ہے"؟

لیکن جدلیاتی مادیت جو اس حد تک عاجز نہیں ان سوالوں کا جواب کچھ اس طرح دیتی ہے کہ "جبری مسلک" میں یہ سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے خواہ وہ جبر الٰہی ہو کہ جبر مادی، اس لئے کہ جب کبھی بھی انسان آزادانہ انتخاب کرتا ہے مسئولیت کے سوالات درپیش نہیں ہوتے مثلاً یہ کہ وہ کس چیز کا انتخاب کرتا ہے؟ "اور کیوں"؟

تاہم سارتر نے انسانی "اختیار" کے سوال کو چونکہ مابعد الطبیعیات کی سرحدوں تک پہنچا دیا ہے اسے "خیر اور شر" میں امتیاز کا کوئی نہ کوئی ضابطہ پیش کرتے ہی بنے گی یعنی یہ کہ عملاً ایک فرد کے لئے انتخاب کا معیار کیا ہوگا؟

بقول ہائیڈگر[1] جو سارتر کے افکار کا اصل ماخذ ہے "اس صحرائے کائنات میں انسان کو تن تنہا دھکیل دیا گیا ہے" سارتر اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے "رجعت قہقہری" کی اصطلاح یعنی: (DELAINSEMENT)[2] استعمال کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان الٹے پاؤں لوٹ کر اپنے ہی بل بوتے پر الگ تھلگ کھڑا ہے۔ ہمارے فلسفہ میں اس کا قریب قریب مفہوم "تفویض" کی اصطلاح سے واضح ہوتا ہے۔

آخر یہ انسان جو خدا سے آزاد، فطرت سے آزاد اور ماحول اور تاریخ کے جبری قوانین سے آزاد اور خدائی ارادہ کا حامل ہے جب عملی طور پر اپنے آزاد ارادہ کا اطلاق کرتا ہے تو پھر بھی مسئول ٹھہرتا ہے لیکن یہ مسئولیت کس کے سامنے؟

یہی وہ دوسرا مسئلہ ہے جو استفہام کی علامت بن کر سارتر کے سامنے کھڑا ہے وہ ان ہر دو سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہر دو صورتوں میں نہ تو سارتر کے استدلال کی قوت اور نہ منطق کلام کا زور اور نہ ہی اس کے پُرشکوہ قلم کی تاثیر موجود ہے۔

---

[1] : HEIDDEGER

[2] DELAINSEMENT یہ ایک فرانسیسی اصطلاح ہے اور علی شریعتی نے اس کا مفہوم بیان کر دیا ہے نہ کہ ترجمہ (مترجم)

[3] : ASSIGNATION

سارتر کے ہاں خوب و زشت کی اصل کسوٹی حسن نیت ہے یعنی 'خوب' وہ ہے جس کا مثبت انتخاب کیا جائے اور 'زشت' وہ ہے جس کا انتخاب سلبی ہو۔ وہ کہتا ہے کہ عملاً" جب کبھی کوئی فرد یہ احساس رکھتا ہو کہ جو کچھ اس نے انتخاب کیا ہے وہ شیوۂ عام ہے اور دوسروں کو بھی اس کا اتباع کرنا چاہیئے تو وہ 'خیر' ہے اور کہیں اگر یہ احساس ہو کہ صرف وہی اس عمل کا انتخاب کرے گا لیکن دوسروں کو اس پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہیئے تو یہ 'شر' ہے۔"

چنانچہ وہ مثال دیتا ہے کہ "ایک قصائی جو خود تو دھوکہ سے گوشت فروخت کرتا ہے لیکن چاہتا ہے کہ دوسرا کوئی اور یہی حرکت نہ کرے لیکن وہی قصائی جب اچھا گوشت کم قیمت پر فروخت کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اپنا اپنا کاروبار اسی طرح انجام دیں"۔

پس 'خیر و شر' کا معیار پہلے تو ذاتی جذبہ ٹھہرا پھر ایک مکمل خیالی صورت حال:
یہ بات کتنی تعجب خیز ہے کہ ایک مادی جو مارکسیت کا حلقہ بگوش ہو وہ انسانی کردار کو اس حد تک انفرادی اور موضوعی بنا کر پیش کرے۔

کیا یہ سمجھنا چاہیئے کہ سارتر کے فلسفہ وجودیت کی اخلاقیات اس حد تک کمزور ہیں؟ اور پائے چوب پہ مبنی ہیں؟ نیز وہ ان کے بدبختانہ عواقب سے صریحاً اور اس قدر بے خبر ہے؟ ایسا ہرگز نہیں!

سارتر کا واحد جواب یہ ہے کہ "اسکے سوا چارہ ہی نہیں"۔

جب ہم کائنات کو ایک مادی کائنات فرض کر لیتے ہیں تو سارتر اور ایسا ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ انسان کی آزادی اور احترام کو فطرت (یعنی قدیم مادیت) یا جدلیاتی مادیت (یعنی جبریہ

مادیت اکے چنگل سے نجات دلا کر اسے اپنے ذاتی اور آزاد ارادہ کے بل بوتے پر اس کے اپنے ہی دونوں پاؤں پر کھڑا کر دے۔ تب وہ ناگزیر طور پر پایا تو اس کو مادی جبریت کے اسی اندھے اور خود ناشناس کنوئیں میں دھکیل دیتا ہے یا اس کو بے مقصد، بے معنی اور بے مصرف بنا کر چھوڑ دیتا ہے اور ساری انسانی قدریں یکے بعد دیگرے دھڑام سے نیچے آ رہتی ہیں۔ اور کس بلا کی تیزی سے!

ہم یہ سنتے ہیں کہ آسمان احمق ہے، ہستی کائنات ہیچ اور خالی ہے۔ فطرت کی حرکت اندھی اور جبری ہے۔ کائنات میں شعور، احساس، مقصدیت اور ارادہ کا فقدان ہے وجود کے کوئی مشخص معنی انہیں چنانچہ اس وحشتناک اور معمورۂ خلا کائنات میں انسان کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے جہاں ہر قید و بند سے آزاد، یکا و تنہا وہ اپنے ہی بل پر سب سے الگ تھلگ کھڑا ہے۔ وہ مجسم ارادہ آزاد ہے جسے اپنی قدروں، اپنے مقصد اور اپنے حقائق و معنیٰ کی خود ہی تخلیق کرنی ہے۔

گویا وجودیت نے فرد کو ایک اسپورٹس کار مہیا کر دی ہے جو ارادہ اور آزادی کی حامل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں کہتی جاتی ہے "جانے کے لئے فی الحقیقت تو کوئی بھی جگہ نہیں تاہم جہاں جی چاہے جاؤ اور یہ کہ جس سمت کا بھی انتخاب کرو گے وہ بجز اس کے کہ تمہارا ذاتی انتخاب ہو گا کسی اور شخص کی انتخاب کردہ سمت میں اور اس میں کوئی فرق نہ ہو گا کیونکہ کہیں بھی تمدن کا کوئی وجود ہی نہیں" اب اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے کہ ایسا تحفہ نہ صرف یہ کہ قطعاً کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ خطرناک بھی ہے!

انسان کو پہلے تو خدا بنا دیا جائے پھر اس کو ایک ایسے آزاد ارادہ سے متصف کر کے

جو جیسے چاہے عمل کر سکتا ہو، اس سوال کا کہ وہ "کیونکر عمل کرے؟" یہ کہہ کر جواب دینا کہ "وہ جیسا چاہے عمل کرے" ایک تباہ کن گرداب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

لیکن سارتر کے لئے اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ ایک تو وہ جدلیاتی مادیت کو اپنے تصور کائنات کی حیثیت سے مان لیتا ہے اور دوسری جانب ہر فرد کے لئے انتخاب کی آزادی کی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ اس مادی اور لاطائل دنیا میں کسی معیار، اقدار یا انتخاب کی کسی کسوٹی اور "خیر و شر" میں امتیاز کے لئے بجز "حسن نیت" کسی اور عنصر کی نشاندہی کیسے کر سکتا ہے؟

سارتر خوب جانتا ہے کہ اس کی معاشرتی اور اخلاقی وجودیت کی مختتم تصویر کچھ یوں بنتی ہے:-

۱- تم میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ تم ہر کام کو انجام دے سکتے ہو۔

۲- جو کچھ بھی کام تم انجام دو گے اگر وہ آزادانہ انجام دیا گیا تو وہی جائز ہے کیونکہ تمہارے انتخاب کے دائرہ سے باہر کوئی ایسا معیار موجود نہیں جو اس میں حائل ہو سکے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کا ہر وہ عمل جس کے لئے وہ آزاد اور اہل ہے، جائز ہے۔

فی الحقیقت سارتر خود بھی اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے چنانچہ دوستو وسکی[1] کے اس مشہور مقولہ کو بار بار دہراتا ہے اور اس سے متفق بھی ہے کہ "اگر ہم کائنات سے خدا کو خارج کر دیں تو انسان کا ہر عمل جائز ہے۔"

آخر میں کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی، انتخاب و اخلاق کے تمام معیارات اور

۱- DOSTOEVSKY

انسان کی باطنی قدروں سے یکسر چھٹکارا پاکر سارتر کی وجودیت" جو "مستقل ارادہ" اور اس کائنات اور اس معاشرہ میں فرد کی بالکلیہ آزادی کا اعلان کرتی اور اسی کے لئے کوشاں بھی ہے۔ اس سے یہ خطرہ تو لاحق نہیں کہ کائنات، فطرت میں انسان کے خدا بننے کی بجائے دراصل ایک شیطان معرض وجود میں آگیا ہو؟

"مارکسیت اور مذہب"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کل کے دور میں مذہب کے بارے میں گفتگو کرنا سخت دشوار ہے کیونکہ جدید نسل کا ذہن اس کو بحیثیت ایک ترقی پسندانہ اور شخصیت کی تکمیل و حریت فکر کا ذریعہ خیال کرنے پر مشکل ہی سے مائل ہوتا ہے۔

لیکن یہ جدید ذہن ہے کیا؟ اس کی تشکیل کیونکر عمل میں آئی اور اس نے یہ رویہ کس طرح اپنایا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ مغرب ہی سے درآمد ہوا ہے اور مغرب کی دیگر مصنوعات و مظاہر تمدن کی طرح اس پر بھی مغرب کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔

جب ہم مشرق کے موجودہ روشن خیال دانشوروں سے مغرب کا تذکرہ کرتے ہیں تو جس چیز کی جانب فوری ذہن منتقل ہوتا ہے وہ مغرب کی سرمایہ داری، صنعت، مسیحی مذہب استعماریت لبرل بورژوائی تہذیب، نیز مغرب کا رد کرتے وقت یا اس کی نفی کرتے وقت مارکسیت ہی کو اس کے خلاف سب سے مہلک ہتھیار خیال کیا جاتا ہے حالانکہ مشکل ہی اس بات کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ خود مارکسیت بھی ٹھیٹ مغرب ہی کی تاریخ، نظام معاشرت اور اسی ثقافت کی پیداوار ہے۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں کہ اس کے بانیان اور چوٹی کے قائدین تمام کے تمام مغرب ہی کے خمیر سے پروان چڑھے ہیں بلکہ مارکسیت کا تجزیہ کرتے وقت اس واقعہ کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس کا بالائی ڈھانچہ جس زیریں ڈھانچہ پر قائم ہے وہ بالکلیہ مغرب کا بورژوائی صنعتی نظام پیدائش ہے۔

مارکسیت معاشرہ کو ادعائی انداز میں دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ایک تو بالائی ڈھانچہ اور دوسرا زیریں ڈھانچہ ثانی الذکر کو وہ "نظام پیدائش" کے مترادف خیال کرتی ہے جس کی تشکیل "ابزار پیدائش" کے مطابق عمل میں آتی ہے اور اول الذکر کی شکل اور نوعیت کا انحصار مذہب، اخلاق، ادبیات، آرٹ، نفسیات اور سیاسی و معاشرتی و اقتصادی نیز انسیاتی اور وجودیاتی افکار و عقائد پر اور ان سارے کے سارے نظریات پر جو "ابزار پیدائش" ہی کی ذیلی پیداوار کے طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اب اس بدیہی اور محسوس واقعہ کی تردید کیونکر ممکن ہے کہ سرمایہ داری اور مارکسیت دونوں میں ابزار و وسائل پیدائش ایک سے ہیں اور ہمیشہ سے رہے ہیں۔ پھر یہ واقعہ بھی اپنی جگہ ہے کہ فاشیت اور پروٹسٹنٹ تحریک میں بھی ابزار پیدائش ایک ہی رہے ہیں۔

پروٹسٹنٹ تحریک، سرمایہ داری، مارکسیت اور فاشیت! یہ چاروں دراصل مادیت ہی کی اولاد اور ایک ہی خاندان اور مغرب کے آغوش میں پروان چڑھے ہیں۔ مگر نتیجہ کہ انہوں نے اپنے اپنے لئے ایک نئی راہ نکال لی۔

پروٹسٹنٹ تحریک ہے تو مذہبی لیکن اس نے محبت کا دامن چھوڑ کر اقتدار کا راستہ اختیار کر لیا اور عیسائی مذہب کے اندر ایک ایسے نظریہ اور ضابطۂ اخلاق کی داغ بیل ڈالی جو بورژوائی طرزِ زندگی سے مطابقت رکھتا ہو۔

سرمایہ داری نے اپنے جمہوری اور لبرل نظریات کا پرچار سترہویں صدی کے قالوسینین کی مادیت کو بنیاد بنا کر شروع کیا لیکن رفتہ رفتہ احترام انسانیت اور حریت کے تصورات کو سائنس و فلسفہ میں مدغم کر کے ایک ایسی ثقافت تشکیل دے دی جو جدید بورژوائیت کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

مارکسیت میں انسانی وجود، انسانی تاریخ اور حیات انسانی کے تمام شئون کی توجیہہ اقتصادی بنیادوں پر کرتے ہوئے، اشتراکیت ایک ایسے خالص اقتصادی نظام کا قالب اختیار کرلیتی ہے جو "صنعتی ترقی کے ذریعہ فراوانی" کی اساس پر استوار ہے چنانچہ ہیگل کی جدلیات کو واسطہ بناکر انسانیت کی تاریخ میں خدا کی تلاش ہونے لگی اور معاشی افراط کے بل بوتے پر پرولتاری طبقہ کے لئے بورژوائی طرز حیات کا سامان ہونے لگا۔

فاشیت یوں تو مارکسیت ہی کی آب وہوا میں پلی بڑھی لیکن بنیادی طور پر اس نے فنی ماہرین اور بیوروکریسی کی تحریک کا قالب اختیار کرلیا جو اقتدار کے دو سروں یعنی سرمایہ داری اور پرولتاری طبقہ کے مابین کوئی مقام نہ پاسکی اور بالآخر انہی کا آلۂ کار بن گئی لہذا اس نے خود بھی اقتدار وحاکمیت کا راستہ اپنالیا۔ اس طرح فاشیت میں متوسط طبقات یعنی بورژوائیوں کی طاقتوں کا جھگڑا ہوگیا۔

ان چاروں تحریکات میں، جن میں سے ایک تو مذہبی دوسری اقتصادی تیسری ایک انقلابی طبقہ کی نظریاتی تحریک اور چوتھی ایک جارحانہ نسلی تحریک ہے، آخر کون سی قدر مشترک ہے؟

۱۔ اولاً انسان کی ذات میں کسی بھی غیرمادی یا روحانی عنصر کا قطعی انکار نیز انسان کی اس خام خیالی کا کھیر دیس نکالا کہ اس کے وجود میں کسی ماورائے مادہ جوہر کا بھی دخل ہے اور یہ کہ وہ صعود کی جانب رواں دواں ہے یا فطرتاً ایک تصوریت پسند ہستی ہے

۲۔ دوسرے یہ کہ انسانی نظریات و احتیاجات محض مادی اشیائے صرف اور اقتدار کے تنگ دائرہ میں محدود ہی نہیں بلکہ معاشی ضرورت ہر دوسری ضرورت پر حاوی ہے۔

۳۔ فلسفیانہ فکر یا کم از کم اخلاقیات و نفسیات کا تمام تر انحصار مادیت پر۔

۴۔ اقتصادی بالادستی اور احتیاجات کی تکمیل کے لئے مشین پر کاملاً انحصار، نیز پیداوار کی پرستش اور نتیجتہً مشین کی اس جدید تمدن کے سب سے بڑے بت کی حیثیت میں تحویل۔

۵۔ لہٰذا ناگزیر طور پر مذہبی عقائد اور ایمان و مذہب کی روحانی جہت کے خلاف نبرد آزمائی کیونکہ ان کے خیال میں مذہب ہی دراصل اقتصادی اور مادی بالادستی میں سب سے بڑی رکاوٹ اور مزاحم قوت بن کر حائل ہو جاتا ہے۔

پروٹسٹنٹ مذہب جو پہلے پہل مسیحیت کے اندر رہتے ہوئے جدید بورژوائی طبقہ کے حق میں ایک اصلاحی تحریک تھی، وہ بعد کو بھی اسی طبقہ میں محصور ہو کر رہ گئی اور عالمی ذہنی تحریک نہ بن سکی۔

فلسفہ وجودیت جو کسی زمانہ میں ایک معاشرتی تحریک اور دعوت بن کر اپنے آپ کو جاگر کرتا رہا مغربی معاشرہ کی نگاہ میں اسے حال ہی میں خیرباد کہہ دیا گیا۔

فاشیت اسی تیز رفتاری سے زوال پذیر ہوئی جس سرعت کے ساتھ ابھری تھی ویسے بھی ایک مخصوص فلسفیانہ اور نظریاتی مکتب فکر کی حیثیت سے اس جہانِ زمان و مکان میں اس کا کوئی مقام نہیں۔

جہاں تک سرمایہ داری کا تعلق ہے اوّلاً تو اس میں انیسویں صدی سے زبردست تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، ثانیاً وہ کوئی باضابطہ اور مربوط نظریاتی مکتب نہیں بلکہ اوّل و آخر ایک اقتصادی اور معاشرتی نظام ہے۔ دین و مذہب سے اس کا اختلاف بھی بالواسطہ ہی ہے۔ ان معنوں میں کہ مذہب دشمن مفکرین سائنس کے نام پر نہ کہ سرمایہ داری اور بورژوائیت کے نام پر دین سے آمادہ مبارزت ہیں، ہر چند کہ یہ مفکرین اسی معاشرتی نظام کے پروردہ اور اسی سے وابستہ ہیں اور

جس سائنس پر وہ انحصار کرتے ہیں۔ اس میں جدید بورژوائیت ہی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اور اب مارکسیت!

۱: پہلے تو یہ کہ مارکسیت ایک عالمی تحریک اور دعوت ہونے کے علاوہ مذہبی، ملی یا ثقافتی حدود میں مقید نہیں۔

۲: دوسری بات یہ کہ ایک معیّن و مشخّص اور مکمل نظریاتی تحریک کی حیثیت سے چند محکم اور ٹھوس ادعائی یا ادعائی تحکمات سے سرشار بھی ہے اور انہی کا پرچار بھی کرتی ہے۔

۳: تیسرے یہ کہ مارکسیت ایک مخصوص اقتصادی یا سیاسی نظام ہی نہیں بلکہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی وجود کی ہر جہت کو احاطہ کئے ہوئے ہے نیز ہر فرد اور معاشرہ کے مادی و روحانی اور ذہنی و اخلاقی تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

۴: مارکسیت ایک فلسفیانہ مسلک و بنیاد رکھتی ہے جس پر فرد اور معاشرہ کے ماضی و مستقبل کے تمام مسائل کا تجزیہ اور ان کا حل منحصر ہے۔

۵: اور یہی بنیادِ محکم مارکسیت کا اصل ماخذ ہے۔ یعنی جدلیاتی مادیت۔ اسی وجہ سے اس میں اور شدّ قسم کے مذہبی جنون میں ایک واضح اور ناقابل تردید مشابہت پائی جاتی ہے۔

۶: مارکسیت کے نقطۂ نظر سے جدلیاتی مادیت قدیم یونان یا اٹھارویں صدی کی لادینی مادہ پرستی اور فطرت پرستی کی طرح صرف ایک فلسفیانہ نظریہ ہی نہیں کہ انسان اور کائنات کے بارے میں محض ایک فلسفیانہ تجزیہ کا اظہار کرے بلکہ "حقیقت کو مکمل سائنٹفک انداز میں بیان کردینے" کی وہی ایک اہل ہے اور اپنے مشن کے ایک کٹر داعی کے انداز میں کوئی بھی دوسرا حریف فلسفیانہ نظریہ اس کو قطعاً گوارا نہیں۔

اس پس منظر میں مارکسیت خود کو "حقیقتِ مطلقہ و تمام" اور اپنے سوا جو کچھ بھی موجود ہے

اس کو "باطل مطلق" شمار کرتی ہے، پھر بڑے زور و شور کے ساتھ اور پیغمبرانہ جوش تبلیغ سے سرشار اپنا سب سے اہم منصب اور فریضہ یہ سمجھتی ہے کہ مذہب کے تمام اشکال کا منظم طریقہ پر سرے سے قلع قمع کر دیا جائے اور چونکہ مارکسیت کے نزدیک مذہب نہ صرف باطل ہی ہے بلکہ افراد کی عقل و دانش کی ضد اور گھاٹے کا سودا ہے لہٰذا لوگوں کا سب سے بڑا دشمن اور ان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہے۔ طریقہ یہ کہ وہ اپنے اس ادعا کا برملا اظہار کرتی ہے جیسا کہ خود لینن کا قول ہے۔

"مذہب کے ساتھ بڑا ہی بے رحمانہ سلوک کیا جانا چاہیے"

مارکسیت کی مذہب دشمن سرگرمیوں کی فلسفیانہ اساس تلاش کرنے کے لئے ہمیں ان مفکرین کی تحریروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جنہیں مارکسیت کے حامی جدید آیڈیالوجی گروہ کے نام سے یاد کرتے ہیں چنانچہ مارکس اور اس کی پیروی میں لینن بھی یہ مشورہ دیتا ہے کہ خود کمیونسٹوں کو چاہیے کہ قاموسیین اور فیورباخ کے ادب کو زیادہ شائع کروائیں۔ خاص طور پر آخر الذکر تو ہیگل کی تصوریت اور مارکس کی جدلیاتی مادیت کے مابین ایک کڑی کا کام دیتا ہے۔ فیورباخ، ہیگل کے مخروط کو الٹ دینے کا بھی ذمہ دار ہے جس کے بارے میں مارکس اور انجلز کا دعویٰ ہے کہ اس کام کو انہوں نے انجام دیا ہے حالانکہ اس کے بیشتر مقولوں کو ان دونوں نے کسی حوالہ کے بغیر اپنی تحریریں میں جگہ دی ہے اور فیورباخ نے مذہب کی جو تاویل کی ہے اس پر انہوں نے بجز حاشیہ آرائی یا اس کی مزید تفصیل و تکرار کے اور کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دین و مذہب کے خلاف سب سے بڑا الزام "از خود بیگانگی" کا لگایا جاتا ہے اور مارکس کی عظیم ترین دریافت کی حیثیت سے مشہور ہے درآنحالیکہ وہ اساسی طور پر خاص فیورباخ ہی کی تعبیر ہے۔ بیٹے اور باپ یعنی (مسیح و خدا) کے تعلق سے ترتیب معکوس پر مشتمل وہ

معروف قول بھی فیورباخ کی کتاب "روح مسیحیت" ہی میں ملے گا، جس کو بلا پس و پیش ہیگلی مکتب سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ فیورباخ کہتا ہے "یہاں دراصل بیٹے سے باپ پیدا ہوتا ہے مسیح کے اندر خدا کا ظہور نہیں ہوتا بلکہ مسیح سے خدا کا ظہور ہوتا ہے اور مسیح جو خدا بن جاتا ہے وہی انسانی روح کا خارجی مظہر ہے یعنی وہ روح انسانی جو شدت کے ساتھ نجات کی تلاش میں ہے۔ روح القدس کچھ نہیں بجز اس کے کہ روح انسانی جب اپنی ذات میں خدائی شان کے عرفان سے قاصر رہتی ہے تو اس کو ایک مابعد الطبیعی پیکر عطا کرتی ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہے" اسے ایک سماوی تخت خیال پر متمکن کر دیتی ہے۔ دین کی از خود بیگانگی سے یہی کچھ مراد ہے اور اگر خود بیگانگی سے کوئی چھٹکارا پالے تو اپنی ذات تک انسان کی رسائی ہو جائیگی۔ اور اس خود آگاہی کی بدولت اس کو یہ احساس ہو جائے گا کہ انسان اپنا خدا آپ ہے۔

مارکس ایک یہودی کا فرزند تھا اور چونکہ اس دور کے جرمنی میں یہودیوں کے لئے روزمرہ معمولات پر قانونی پابندیاں عاید تھیں اس کا باپ رشتا اپنا مذہب تبدیل کر کے پروٹسٹنٹ بن گیا۔ اپنے ایک رسالہ کے مقدمہ میں مارکس ایک نوجوان ہیگلی کی حیثیت سے رقمطراز ہے کہ فلسفہ پرومیتھیس ہی کے عقیدہ کا ایک پیوند ہے ...... خلاصہ یہ کہ میں تو خداؤں سے نفرت کرتا ہوں۔ خدا کے وجود کی جتنی دلیلیں ہیں وہ خدا کے عدم وجود پر دال ہیں۔ حقیقی شواہد صرف اسی طرح بیان کر دیئے جا سکتے ہیں کہ چونکہ عالم فطرت میں کسی نظام ترتیب کا فقدان ہے اس لئے خدا کا وجود ہے چونکہ کائنات میں لا یعقل امور جاری و ساری ہیں لہذا خدا ہے۔

دوسرے الفاظ میں لا یعقل ہی خدا کے وجود کی اساس ہے۔"

لیکن پرومیتھیس کون ہے؟ یونانی دیومالا میں وہ خداؤں ہی میں سے ایک ہے جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے دوسرے خداؤں کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ ایک

رات جبکہ سارے خدا سوئے ہوتے ہیں، آلو ہی آگ چرا کر انسان کے حوالہ کر دیتا ہے۔ جب خداؤں کو اس راز کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو پابہ زنجیر کر دیتے ہیں۔ انہیں اس بات سے خاصی پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ آسمانی آگ پر انسان کا قبضہ ہو گیا، کیونکہ وہ تو چاہتے تھے کہ روئے زمین پر انسان دوامًا ظلمت اور ذلت و کمزوری کا شکار رہے اور عالم بالا تک اس کی رسائی نہ ہونے پائے۔

مارکس نے پروٹیسٹانی عقیدہ اور معاشرہ کے تصور کو الٰہیات کے فلاسفہ اور ماہرینِ عمرانیات سے اخذ کیا تھا۔ نیز وہ سینٹ سائمن[۱] اور بعد کو پرودھاں[۲] کے زیر اثر رہا۔ لہٰذا یونان کے ضیاتی دور ہی کا طرزِ فکر اس کو ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ یونانی مذاہب کے خدا کا تصور اس نے تمام مذاہب کے لئے عام سمجھ لیا درآنحالیکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ مشرق کے عظیم مذاہب کی مذہبی فکر صحیح معنوں میں بالکل اس کے برعکس تھی اور یونان کے برخلاف انسان و خدا کا رشتہ ایسا نہیں کہ نہ صرف انسان کے اور اس کے مابین کوئی رقابت یا حسد یا بدخواہی نہیں پائی جاتی اور وہ انسان سے کسی طرح خائف بھی نہیں بلکہ وہ بنی نوعِ انسان کے لئے بدرجہ اتم شفیق و مہربان ہے۔ مشرق میں خدا کے پیغام کی غایت یہ ہے کہ بنی آدم کو خاک سے اٹھا کر آسمانوں کی طرف نیز حیواناتِ ارضی کی صف سے سوئے ملائک اور مقامِ ربانی کی طرف عروج بخشے۔ زرتشت کے مذہب میں بنی آدم، "آشاش پندوں" کے شانہ بشانہ اہورامزدا کے غلبہ کے لئے جنگ کرتا ہے اور اسی طرح یہ فوق الفطرت مخلوق "اشاس پند" اور اہورامزدا بھی ہر جگہ اور ہر وقت انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ مانی کے ثنویتی مذہب میں انسان ہی کی ہستی سے نورِ الٰہی کا تحقق ہوتا

۱ـ SAINT SIMON ۲ـ PROUDHON

ہے۔ چین اور ہندوستان کی رمزیت میں سب سے بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان اور خدا کے مابین کوئی ناقابلِ عبور فاصلہ نہیں بلکہ خدا جوہرِ حقیقت اور روح وجود کی صورت میں اس تمام عالمِ طبیعی بلکہ انسان کی رگ رگ میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔ سب سے اہم نکتہ تو یہ ہے کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام، جن میں کائنات کا یکساں نقطۂ نظر پایا جاتا ہے، یہ خیال کرتے ہیں کہ یزدان کی الوہیت الگ "شجرِ ممنوعہ" کی شکل میں درآمد ہوتی ہے اور پرومیتھیس ہی کو وہ شیطان کا نام دے دیتے ہیں۔

جب مارکس یہ کہتا ہے کہ "مجھے خداؤں سے نفرت ہے" تو اس کے الفاظ غور و فکر کے محتاج ہوتے ہیں یا اپنے ایک فلسفیانہ رسالہ کے مقدمہ میں اور پھر خداؤں کو موضوعِ بحث بناتے وقت "نفرت" کا لفظ کچھ غیر فطری سا لگتا ہے۔ نفرت تو ایک جذباتی کیفیت کا نام ہے نہ کہ علمی یا فلسفیانہ اصطلاح۔ اس نفرت کا فی الحقیقت مارکس کی نجی زندگی اور اس کے ناکام عشق میں سراغ لگانا ہوگا اور واقعہ یہ ہے کہ عیسائی پادری جس کا باعث بنے تھے۔

اپنی تنقید کے آخری حصہ میں مارکس کہتا ہے کہ "خدا کے وجود کی تمام دلیلیں اس کے عدم وجود پر دال ہیں" اور یہ کہ "عالمِ فطرت میں کسی نظام ترتیب کا فقدان ہے لہٰذا خدا ہے اور چونکہ کائنات میں خلافِ عقل امور ہیں اس لئے خدا ہے یعنی لایعقل ہی خدا کے وجود کی

اصرار کیا ہے۔

اس بیان میں ایک مغالطہ آمیز منطقی استدلال سے کام لیا گیا ہے، وہ یہ کہ مارکس نے عامیانہ مذہبی تصورات کو اپنے الہیاتی استدلال کی کسوٹی بنایا ہے۔ عامیانہ فکر تو خدا کو ہمیشہ منطقی اور طبیعی قوانین اور عقلیات کے باہر تلاش کرتی ہے اور استثنائی حوادث اور غیر سائنٹفک و غیر طبیعی حوادث و شواہد سے استدلال کرتی ہے۔ اس کے برعکس توحید کے باب

میں مذہبی کتب کے (کم از کم قرآن کو صدی صد) استدلال کا معنی، عالم فطرت، تاریخ، روزمرہ کے مسلمہ قوانین اور کائنات کے مربوط و منظم اور معقول امور ہیں۔ یہ کتب منعرض مشہودات کو ایک شعورِ مطلق کے وجود پر بطور ثبوت پیش کرتے ہیں جو اس کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید، مادہ پرستوں سے بڑے ہی سخت تنقیدی انداز میں یوں مخاطب ہے کہ: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کائنات کا نظام پوچ اور عبث ہے؟ پھر جابجا خود ہی اعلان کرتا ہے: "ہم نے آسمان اور زمین اور اس تمام کو جو ان کے مابین ہے محض باطل ہی نہیں پیدا کیا۔"[1]

قرآنی تعلیمات کے مطابق کائنات کی ہر چیز اسباب و علل کے تابع ہے اور اس کا انحصار سنتہ اللہ پر ہے جو ہرگز تبدیل نہیں ہوتی نیز وجود الٰہی کا سب سے بڑا ثبوت عالم طبیعی کا نظم و ربط ہے جس کی اساس علت و معلول اور عقل و شعور پر ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے متعصب اہلِ فکر اور علم کلام کے مبتدیوں کے استدلال سے کام لیتے ہوئے یا خود غرضانہ سیاسی تخویف کے انداز میں، مارکس اپنے مدمقابل مکاتب کے عام طور پر مسلمہ عقائد سے انحراف کرتا ہے اور بڑا ہی رکیک، غلط اور عامیانہ رویہ اختیار کرتا نیز ان عقائد کا مذاق اڑاتا اور ان کی تردید کرتا ہے۔

مارکس کا صرف ایک ہی سیدھا سادھا تجزیہ جس پر اس نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے جو کافی معروف بھی ہے وہ مذہب کے ماخذ کے سلسلہ میں ہے کہ "انسان مذہب کا خالق ہے نہ کہ مذہب انسان کا خالق" لیکن یہاں مارکس نے صرف فیور باخ کا فقرہ دہرایا

---

[1] سورۂ ص ۔ آیت ۔ ۲۷ (مترجم)

دیا ہے اور اس کوشش میں کہ وہ فقرہ اس کا اپنا دکھائی دے اس نے "خدا" کی جگہ "مذہب" کو رکھ دیا اور پورے کے پورے فقرہ کو بے معنی نہیں تو کم از کم مبہم بنا دیا کیونکہ "مذہب انسان کا خالق نہیں"۔ یہ کیا بات ہوئی؟ کس نے دعویٰ کیا ہے کہ مذہب انسان کا خالق ہے؟

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:۔

"مذہب بنی نوعِ انسان کے لئے خود آگاہی کا ذریعہ ہے کیونکہ ہنوز وہ اپنی خودی پر قابو حاصل نہیں کر سکے ہیں یا دوبارہ اسے کھو چکے ہیں۔ گویا دین و مذہب ان کے اپنے نفس اور ان کی اپنی تقدیر کا ایک محیر العقول تخیل ہے اس لئے کہ اس تقدیر کا کوئی وجود نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین و مذہب سے پیکارِ عالم کے ساتھ پیکار ہے کیونکہ دین ہی عالم کا روحانی جوہر ہے۔

پھر اس کا بیان ہے کہ:۔

"دین و مذہب پر یہ افتاد بیک وقت اصل افتاد بھی ہے اور اس کے خلاف ایک احتجاج بھی۔ دین تو بیچارگی کا شکار ایک سنگدل کا قلب اور ایک بے روح ہستی کی روح ہے۔ وہ فی الحقیقت لوگوں کے لئے ایک افیون ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب ناگزیر ہے کہ مذہب پر تنقید اشکوں کے ایک سمندر پر منتج ہی ہو جس کو مذہب ایک ہالہ کی طرح احاطہ کئے ہوتے ہے"

بھلا غور کیجئے کہ مذکورہ بالا عبارت کو پڑھنے سے کہیں بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ فلسفیانہ گہرائی کے مقابلہ میں ادبی نکتہ آفرینی پر زیادہ زورِ قلم "صرف نہیں ہوا ہے"؟ اگر ہم اصلی جوہر کو الگ کر دیں جو فیور باخ کے نظریہ سے ماخوذ ہے تو اس میں مارکس کی "انشاء پردازی" کے سوا کیا رہ جائے گا؟

جب اس بحث کے آخر میں وہ قدرے سنجیدہ اور معقول طرزِ بیان اختیار کرتا ہے

تب بھی گھوم پھر کر صرف اور صرف فیورباخ ہی کے مرکزی خیال اگرچہ غیر واضح انداز میں اپنی مذہب کی از خود بیگانگی سے معرکہ آرائی پر زور دیتا ہے۔

چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"دین و مذہب پر تنقید کے ذریعہ انسان ایک بڑی غلطی سے چھٹکارا پالیتا ہے تاکہ اس غلطی کی روشنی میں جو اس کی عقل پر حاوی تھی خود فکر کرے عمل کرے اور اپنی اصل خودی کی تخلیق کرے اور اس طرح اپنے ہی اطراف یعنی اصل سورج کے گرد گھومتا رہے" کیا مارکس کی تحریر کا یہ حصہ "انسان کی ملحدانہ اصل" کے سوا بھی کچھ ہے جو فیورباخ کے بنیادی نظریہ سے ماخوذ ہے ؟

"دین و مذہب ایک موہوم و محیر العقول منبع اور تقدیر آدم ہے" یعنی چہ ؟ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عامیانہ اور مذہب کے بارے میں عام طور پر مروجہ غلط تصورات ہی مارکس کے ذہن میں ہیں کہ دوسری دنیا بھی اقتصادی اور انسانی زندگی کے تمام تر لوازمات کے ساتھ محض اس دنیا کا ایک نعم البدل ہے حالانکہ اس کے برعکس جس نے بھی دینی کتب کے اصلی متن کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے عمل میں ان کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دوسری دنیا انسان کی اسی دنیوی زندگی کے منطقی، سائنٹفک اور کاملاً قابل فہم نہ کہ محیر العقول تسلسل کا نام ہے۔ جنت و دوزخ یعنی دوسری دنیا کے اعلیٰ و اسفل درجات ہمارے ہی اپنے عمل کا پرتو ہیں جس کا ہم میں سے ہر فرد اپنے معاشرہ کی خدمت یا بد خدمتی کے سلسلہ میں ذمہ دار ہے۔ نیز اس دنیوی اور مادی زندگی کا نتیجہ عائد ہے کہ ہم نے اپنی انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں ارتقائے انسانیت کے لئے کون سی راہ کا انتخاب کیا۔ آیا اپنے اندر اخلاقی قدریں پیدا کیں اور ان کو دوسروں تک پہنچایا بھی یا اس کے برعکس اپنی ہی فطرت کی مٹی پلید کر لی۔

اور اپنے ماحول کو بھی گندا کر دیا۔

ہم نے دیکھا کہ کائنات کے کارخانہ کو غیر عقل پر مبنی یا محیر العقول، یہاں تک کہ غیر سائنٹفک سمجھ بیٹھنا کارگاہ عمل کی نفی کرنے اور حیات کے تسلسل سے قطع تعلق کر لینے کے مترادف ہوگا اور یہی قطع تعلق ہے جس کی بنا پر مارکس خود بھی انسانیت کو ایک سنگدل دنیا اور بے روح ہستی میں مقید کر دیتا ہے اور اس طرح بے حس مادی دنیا کے ہاتھوں انسانیت جدلیت کی اندھی اور کبھی ختم نہ ہونے والی کشمکش کا کھلونا بن کر رہ جاتی ہے جس کو وہ اشکوں کے سمندر میں غرق کر دیتا ہے جو کفر و الحاد کے مایوس کن ہالہ سیاہ سے گھرا ہوا ہے۔

دین و مذہب کا متعصبانہ رد کرتے ہوئے مارکس نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں خاص طور پر اس کا یہ مقولہ بڑا ہی قابل غور ہے کہ "دین و مذہب ایک محیر العقول منتہا اور تقدیر یا دم کا تعلق ہے حالانکہ منتہا اور تقدیر کا تو کوئی وجود ہی نہیں" مارکس یقیناً ایک صدی قبل اس طرح کی بات کہہ سکتا تھا جبکہ ابھی بیسویں صدی اور بالخصوص دوسری عالمی جنگ کے بعد کا قنوطی دور معرض وجود میں نہیں ہوا تھا تاکہ اپنی اس تحریک کے نتائج و عواقب کو بچشم خود دیکھ پاتا اور اسے احساس ہوتا کہ وہ انسانیت کو کس حد تک تباہی کے غار کی طرف دھکیل سکتی ہے "حقیقت میں انسان کا کوئی منتہا اور مقدر نہیں"۔ ٹھیک یہی تو دین و مذہب اور مادیت کا بنیادی اختلاف ہے۔

یہ کہ انسان اس دور میں ذلت آمیزی کی جانب بڑی سرعت کے ساتھ رواں دواں ہے اور خاص طور پر نوجوان نسل بغاوت محض پر آمادہ ہے اور فلسفہ، آرٹ اور ادب و ثقافت سب کے سب ہر چیز کو بشمول انسانیت بے معنی کہتے ہیں تو اسی لئے کہ کائنات

اور انسان کی اپنی ذات کے اندر شعور وجود خداوندی سے انکار کر بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کائنات بے مقصد اور انسان بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کہ نہ تو سارتر کی وجودیت اور نہ مارکس کے واسطے سے ہیگل کی جدلیاتی قلابازیاں ان کو کوئی معنی پہنا سکتی ہیں اور نہ کوئی شعور بخش سکتی ہیں:

یہ امر تو تعجب خیز نہیں کہ بورژوایت کے زوال اور مارکسیت کا دور دورہ ہونے کے بعد تاریخ میں جدلیات کی کارفرمائی ختم ہو چکے گی اور دعویٰ و نقیض[1] دعویٰ کی کشمکش صلح و آشتی کے ساتھ مل جل کر بسر کرنے پر منتج ہو گی۔ پھر مارکس کیوں اس کی نشاندہی کرنے پر قادر نہیں کہ اس کے بعد منتہائے بشریت کیا ہو گا؟ دوسری دنیا کی بات تو الگ رہی خود اسی دنیا میں؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب نہ تو قدیم مادیت کے پاس ہے اور نہ جدلیاتی مادیت کے پاس۔ اس لئے کہ بقول رینی گوینان[2] "کائنات چونکہ بامعنی و بامقصد نہیں لہٰذا انسان کو بھی بے معنی و بے مقصد ہونا چاہیئے" اور خود مارکس کے الفاظ میں ایسی انسانیت میں حقیقی "منتہا" کا فقدان ہی ہو گا۔

اس کے برخلاف اسلام اس کائنات میں انسانیت کو ایک باعزت مقام سے بھی زیادہ بہت کچھ دیتا ہے یعنی "لقد کرمنا بنی آدم"[3] وہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو "ایسی بے بس مخلوق نہیں بنایا جو اپنے آپ کو بھلا بیٹھے اور اپنی قدروں اور اپنے قواء کو خدائی وجود میں تلاش کرتا ہے اور گریہ وزاری کرتا ہوا ان قدروں اور قواء کی التجا کرتا ہے" بلکہ اس کو اپنی امانت کا امین[4] اور دنیا میں اپنا جانشین[5] بنا کر بھیجا!

۱؎ THESIS AND ANTI-THESIS ۲؎ GUENON ۳؎ القرآن آیت ۷۰ سورۃ ۱۷ ۴؎ انا عرضنا الامانۃ علی السموٰت والارض (باقی اگلے صفحہ پر)

کیا ہے۔ فیورباخ اور مارکس خدا کے مقابلہ میں انسان کی از خود بیگانگی " پر تکیہ کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں انسان کی اصالت و مسئولیت اور اپنے کمال و نجات کے تعلق سے حضرت علیؑ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ :

" تیرا درد تو خود تجھ میں پنہاں ہے اور تو نہیں جانتا اور تو نہیں دیکھتا کہ تیرے درد کی دوا بھی تیری ہی ذات میں ہے "

ایسا لگتا ہے کہ مذہب کے بارے میں مارکس کی معلومات صرف اسی حد تک محدود تھی جو اس کو اپنے یہودی نژاد باپ سے ورثہ میں ملی تھی جس نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا تھا اور پروٹسٹنٹ بن گیا تھا۔ مارکس تو یہودی مذہب، پروٹسٹنٹ عیسائیت اور اسلام کے مشترک بنیادی اصولوں سے بھی نابلد تھا جیسے تفویض، کہا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو خود ہی کرۂ ارض پر آزاد چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ جدوجہد کی زندگی گزارے اور اپنی نجات کا راستہ خود ہی تلاش کرے۔

وہ جب مذہب کے کسی خاص مکتب کو ہدف تنقید بناتا ہے تو اس امر کو ترجیح دیتا ہے کہ اصل معتقدات اور متن سے استناد کرنے کی بجائے ان خرافات اور توہم پرستیوں پر اپنے دلائل کی بنیاد رکھے جن میں عام جہلا اور مذہب سے انحراف کی طرف مائل لوگ مبتلا ہو چکے ہیں کیونکہ اس طرح تحقیق کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور مذہب کا مذاق اڑانا بھی نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ وہ گویا مذہب کے ساتھ پیکار کے لئے سہل ترین راستہ کی تلاش کرتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے نتیجہ میں اس کا انداز ایک فلسفی عالم کے بجائے

ذ: بین یحملنها و حملها الانسان - آیت نمبر ۷۲ - سورۃ [illegible]

؎: انی جاعل فی الارض خلیفة - آیت ۳۰ - سورۃ ۲ -

، مبلغ خطیب، یا سوفسطائی سیاست دان کا ہو جاتا ہے لیکن اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں جب تک کہ ایمان اور مذہب پر حملہ سے مارکسیت کے غلبہ کی راہ ہموار ہوتی ہے کیونکہ اس تحریک کے نقطۂ نظر سے مقصد ذرائع کو جائز بنا دیتا ہے۔ خواہ اس کے حصول میں بقول لینن مذہب کے ساتھ بے رحمانہ سلوک بھی روا رکھنا پڑے۔ لہذا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ جدلیات کا سائنٹفک فلسفی، مارکس مذہب پر ایک علمی بحث چھیڑنے کے بجائے مذہب کی "فکری اور حکمیاتی" باتوں کو چھوڑ کر اور مذہبی لوگوں کے "تاریخی اور معاشرتی" کردار کو تنقید کا نشانہ بنا کر اس تقابلتہً آسان راستے سے اس قدرے مشکل مہم کو سر کرنا چاہتا ہے جو مذہب کے فکری اور حکمیاتی حقائق کا نقش محو کر دینے سے متعلق ہے چنانچہ اس کا استدلال یہ ہے کہ دین و مذہب، معاشرہ میں ناانصافی اور بے اعتدال کے اثبات ہی کا ایک ذریعہ ہے یہاں وہ سترہویں صدی کے مادیین یا قدیم دور کے ماہرین فطریت کی طرح کسی فلسفیانہ استدلال یا سائنٹفک بحث مباحثہ کا آغاز نہیں کرتا حتیٰ کہ دین کی اساسی باتوں اور اصل و مستند مذہبی تحریکات کا تذکرہ تک نہیں کرتا۔

مارکس کی تحریروں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"عیسائیت کے عمرانی اصولوں نے قدیم غلامی کو عقلی جواز بخشا۔ قرون وسطے کے جاگیرداری نظام پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی اور ذرا سوچیے کہ حسب ضرورت پرولتاریت پر ظلم بھی ڈھائے گو کہ اظہار افسوس کرتے ہوئے:۔

"عیسائیت کے عمرانی اصول اس ضرورت کی بھی تبلیغ کرتے ہیں کہ ایک حکمران طبقہ اور ایک محکوم طبقہ کا وجود ہونا چاہیے۔ پھر بھی عمرانی اصول اس دنیا کی تمام مظلومیوں کے لئے اگلی دنیا میں معاوضہ کی تلقین کرتے ہیں اور اس دنیا میں ظلم و ستم کی زندگی کی مدافعت

کو ازلی گناہ کی پاداش پر محمول کرتے ہیں یا پھر ایک ایسے ابتلا سے کہ خدا نے اپنے بندوں کی آزمائش کے لئے خود ہی انہیں اس میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

• عیسائیت کے عمرانی اصول بے غیرتی، حقارت، ذلت و خواری، اطاعت گزاری اور عاجزی، مختصر یہ کہ تمام گھٹیا اور ادنیٰ اوصاف کی تعلیم دیتے ہیں۔ پرولتاریت کو اس تذلیل کے قبول کرنے سے انکار کرنے کی خاطر روٹی کی خواہش سے کہیں زیادہ شجاعت، احترام ذات، تفاخر اور آزادی کی تڑپ درکار ہے۔"

• عیسائیت کے عمرانی اصول ریاکارانہ ہیں اور پرولتار طبقہ انقلابی ہے۔"

کیا یہ سب کچھ اس کارل مارکس کی زبان کہہ رہی ہے جس کا اخلاقیات کے بارے میں یہ خیال ہے کہ نظریہ اخلاق، اقتصادی پیداوار کا زائیدہ ہے؟ کیا یہ وہی کارل مارکس ہے جو 'نظام' اور 'نظریہ' کے مابین کسی فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھنا چاہتا؟ ان دونوں مفروضات پر یقین کر لینا کتنا مشکل ہے۔

لیکن مقام افسوس ہے کہ یہ کارل مارکس ہی ہے جو پوپ کو عیسیٰ سمجھ بیٹھتا ہے تاکہ تمام غیر مارکسی مفکرین حتیٰ کہ آزاد خیال عیسائی بھی اس کے ہم نوا بن کر یہ بھول جائیں کہ مارکس جن خطوط پر یہ استدلال آگے بڑھانا چاہتا ہے وہ کس قدر کمزور ہیں۔

اس طرح کا استدلال و استنباط صرف عامیانہ شیوہ ہو سکتا ہے البتہ ایمان فروش ملا اور پروپیگنڈہ باز سیاست دان جلب منفعت کی خاطر یہ وطیرہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ورنہ یہ بڑا ہی سوقیانہ پن ہے کہ مذہبی علماء کی کمزوریوں اور بداعمالیوں پر تنقید کے سہارے اس نتیجہ کا استخراج کر لیا جائے کہ مذہبی علوم بے ہودہ ہیں۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا کے پادریوں نے معاشرہ میں جو کردار ادا کیا تھا اس آئینہ میں دو ہزار سال قبل کے فلسطین میں حضرت عیسیٰؑ کے کردار کا عکس

دیکھنے کی کوشش کرنا اگر جان بوجھ کر نہیں تو نری جہالت ہے۔ فلسطین حبشہ اور شمالی و مغربی یورپ میں ان ہزاروں شہیدوں کو جو رومی استعمار کی ملک گیری کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ خوفناک بہیمانہ مظالم ڈھانے والوں کے زمرہ میں شامل کر دیا جنہوں نے بلا لحاظ ہزارہا عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کا قتلِ عام کیا تھا، انتہائی پست اور گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

کیا واقعی مارکس اس سے ناواقف ہے کہ آزاد عیسائی مفکرین نے قرونِ وسطے سے لیکر حال تک بھی کلیسا اور پادریوں اور عیسائی پیشواؤں نیز بقول مارکس "عیسائی عمرانی اصولوں" کے خلاف سینہ سپر ہو کر مادیت اور مارکسیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر قربانیاں دی ہیں اور اپنے اثر کو منوایا بھی ہے؟ ایک شہر بارسلونا ہی میں وہ (۳۰) ہزار آدمی جن کا کلیسا نے قتل عام کیا تھا سب کے سب عیسائی تھے۔ پھر صد سالہ جنگ کے دوران کیا وہ تمام کے تمام عیسائی نہ تھے جو دوسرے عیسائیوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے تھے؟

طرفہ یہ کہ مارکس بھی اسلام کو رسوائے زمانہ ٹھہرانے کے لئے پادریوں کے انداز میں خلافت کے دور کی بعض مثالوں کا سہارا لیتا ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ خلافت کے ابتدائی دور میں جن ہستیوں نے ظلم وستم کا نشانہ بن کر قربانیاں دیں وہ اسلام ہی کے اوّلین دور کے تربیت یافتہ درخشاں مینار تھے؟

تعجب اس پر نہیں کہ مارکس نے مذہب پر حملے جاری رکھتے ہوئے وہی زبان استعمال کی ہے جو اپنے مخالف مذاہب پر تنقید کرتے وقت مذہبی جنون رکھنے والے پروپیگنڈا بازوں کو زیب دیتی ہے لیکن جو امر زیادہ تعجب خیز ہے اور جیسا کہ مارکس کے الفاظ کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مذہب کو نشانہ بناتے وقت اس نے بحیثیت ان مذاہب کا ہی اسلوب اختیار کیا ہے مثلاً بے غیرتی، تحقیر، تذلیل، اطاعت شعاری، عاجزی

وغیرہ یعنی تمام صفاتِ رذیلہ" پھر وہ اس پر زور دیتا ہے کہ " پرولتاری طبقہ کو اس تذلیل کے قبول کرنے سے انکار کی خاطر روٹی کی خواہش سے کہیں زیادہ شجاعت، احترامِ ذات، تفاخر اور آزادی کی تڑپ درکار ہے" خدا کی شان کہ یہ انسان کے وہ روحانی فضائل اور اخلاقی قدریں ہیں جنہیں مذہب نے ہمیشہ سے اپنے دفاع میں استعمال کیا ہے، انہیں ہم اس جوش و خروش کے ساتھ اس مارکس کی زبان سے سن رہے ہیں جو اخلاقی قدروں اور رسوم معاشری کو ایک خاص اقتصادی نظام اور اس کے زیریں ڈھانچہ کے آفریدہ اور انہیں متغیر اور غیر مقدس خیال کرتا ہے پھر عجیب تر تو یہ کہ ان روحانی فضائل کو وہ 'روٹی' سے بھی بالاتر گردانتا ہے اور کس کی خاطر؟ شرفا اور بورژوائی طبقہ یا نظریہ پرستوں کے لئے نہیں بلکہ خاص پرولتاری طبقہ کے لئے!

ہر چند کہ اخلاق کے ساتھ مذہب کے رشتہ کا ہم پورا شعور رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ کس طرح مذہب ہمیشہ سے انہی اخلاقی قدروں کو حرزِ جان بناتا اور انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں کہ قرونِ وسطے میں کس طرح پادریوں نے انہی اقدار و فضائلِ اخلاق کا جنازہ نکالا پھر یہ کہ کمیونزم اور اخلاق پر پلاخانوف[1] نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے اس کا علم رکھتے ہوئے جب ہم مارکس کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ روحانی اقدار "روٹی" سے بھی بالاتر ہیں تو حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔

کیا یہ مذہب ہی کے اسلحہ خانہ سے لئے ہوئے ہتھیار نہیں جو مذہب کے ساتھ "بے رحمانہ سلوک" کے لئے استعمال ہوئے ہیں؟

یہ مارکسیت ہی ہے جو ہر آئینہ سامنے کے جارہے تھا؛ ہر مکاتب سے بڑھ چڑھ کر مذہب

---

[1] : PLAKHANOV

کے خلاف آمادہ پیکار ہے اور سارے اندازوں کے مطابق مذہب سے کہیں زیادہ متعصب اور شدت پسند ہے لیکن جس استدلال پر وہ تکیہ کرتی ہے وہ اتنا ہی کمزور، مبہم اور بے سروپا ہے۔ ایک ہی سانس میں وہ حالیہ صدیوں اور بالخصوص سترویں صدی کے سائنسدان اور مادیت پر مبنی تصوریت پسندوں کے انداز میں مذہب کو امورِ فطرت میں علت و معلول کے سائنسی اصولوں سے ناواقفیت پر محمول کرتی ہے اور اسی سانس میں مادی نفسیات دانوں کے خیال کے مطابق انسان کی نفسیاتی کمزوریوں، خودشناسی اور نفس پر قابو کے فقدان کی پیداوار سمجھتی ہے، نیز انیسویں صدی کے مادی ماہر عمرانیات کا کردار ادا کرتے ہوئے صنعتی نظام اور فنی ترقیاتی نظام کا منطقی حاصل گردانتی ہے، پھر ایک سادہ لوح کے سطحی انداز میں حکمران طبقوں کی اس عیاری پر محمول کرتی ہے جو محکوموں یعنی عوام پر اپنی ستم رانیوں کو عقلی جواز بخشنے کے لئے استعمال کرتے ہیں گویا ہم نے دیکھا کہ مارکسیت مذہب کے خلاف ان تمام دلائل سے کام لیتی ہے جو عہد قدیم سے لے کر اس وقت تک زیر بحث آتے رہے ہیں اور ان میں خود سے جدلیاتی مادیت کے نام پر رتی برابر بھی اضافہ نہیں کرتی۔

مارکسیت اور مذہب کے باہمی نزاع کے سلسلہ میں سب سے اہم نکتہ جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ چونکہ مارکسیت کی بنیاد جدلیاتی مادیت پر استوار ہوتی ہے لہٰذا وہ مذہب سے دراصل اس کے جوہر اصل یعنی "خدائے غیب کی پرستش" اور کائنات کے آفاقی نقطہ نگاہ کی بناء پر ستیزہ کار ہے۔ لیکن ہرگز ایسا نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا تو مارکسیت اور مذہب کے مابین اختلاف صرف فلسفیانہ اور سائنٹفک حدود کے اندر نقاطِ نظر کے اختلاف تک ہی باقی رہتا جیسا کہ مذہب کے تعلق سے ہیگل کی ملحدانہ تصوریت یا سارتر کی مادی وجودیت یا ڈیڈیرا، ٹ اور ارنسٹ

دنیا کی لادینی انسیات کے اختلاف کی صورت تھی۔

اس کے برعکس مارکسیت مذہب کے خلاف انتہائی سخت گیرانہ اور اس حد تک معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرتی ہے کہ حال ہی میں یعنی ۱۹۶۱ء میں جب کہ کارل مارکس کو پیدا ہوئے بھی ایک سو سال گزر چکے تھے، سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی اپنے سرکاری پروگرام میں "مذہبی اعتقادات کے خلاف اپنی طویل اور بے رحمانہ جنگ" جاری رکھنے کے لئے اپنے عزم کا اعادہ کرتی ہے تاکہ سوویت عوام میں کمیونزم کو راسخ کرنے کا مقصد پورا ہو سکے۔

مذہب کے خلاف اس قدر غضبناک اور تعصب سے مملو محاربہ کا اصل سبب محض مادیت اور مذہب پر مشتمل دو متضاد فلسفوں کا اختلاف نہیں بلکہ یہ اختلاف ایک اساسی نوعیت کا حامل ہے اور انسانیت کے بارے میں دو باہم متضاد تصورات پر مبنی ہے، اور نتیجتاً اخلاق، زندگی، معیشت، ثقافت اور تعلیم و تربیت یعنی من حیث الکل معاشرہ اور عالم میں انسان کے غائی و تاریخی منتہا کے تعلق سے دو متضاد نظریات جنم لیتے ہیں۔

اس خصوص میں ایک اور اہم نکتہ غور و تامل کا محتاج ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے گوناں گوں مذاہب ہی میں سے اسلام بھی ایک مذہب ہے جو خدا کی توحید کے تعلق سے مارکسیت کے ساتھ اپنے اختلاف کے قطع نظر انسانی اور معاشری مسائل میں کئی پہلوؤں سے مارکسیت کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ ان مشابہ پہلوؤں پر تفصیل یا اختصار کے ساتھ مائیکل اقلق، عمر اوزغان، بشیر محمد اور بشیر علی اور مغربی میں میکسیم روڈنسن نے بحث کی ہے اور یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ وہ مسے

سرے پر جو لوگ ہیں ان میں چند ایسے لوگ بھی شامل ہیں کہ مسلمان نوآبادیات مثلاً افریقہ میں جنرل سالان اور الجیریا میں جنرل شارون جنہوں نے خود ہی قتل عام تک سے دریغ نہیں کیا، وہ بھی اسلام پر اسی قسم کے الزامات عائد کرنے نہیں ہچکچاتے۔ اوّل تو کوئی بھی باہم متناقض مکاتب فکر ہوں ان میں کچھ نہ کچھ مشابہت کے عناصر موجود ہی ہوتے ہیں جیسا کہ جرمنی کی فاشیت اور یہودیوں کی صیہونیت کے مابین، مادی انسیات اور مقدس تصوف کے مابین اور خود مارکسیت اور سرمایہ داری کے مابین۔

دوسرے یہ کہ آئیڈیل کی مشابہت کو نظریاتی مشابہت کے ساتھ خلط ملط کر لیا جاتا ہے کیونکہ دو متضاد نظریاتی معاشروں میں آئیڈیل کی مشابہت ممکن ہے۔ مثلاً تمدن سائنٹفک ترقی اور مادی ترقی، کسی نوآبادیاتی معاشرہ کے بھی آئیڈیل ہیں تاکہ ان کے تحقق کے لئے ہاتھ پاؤں مارے لیکن بنیادی طور پر استعماری طاقتوں کی آئیڈیالوجی بھی یہی ہے یعنی وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک ترقی یافتہ اور متمدن استعماری طاقت کی نوآبادی بن جانے سے ایک پسماندہ نوآبادی جلدی ہی متمدن بن سکتی ہے اور سائنٹفک اور فنی ترقی اور اور معاشی خوشحالی تیز مادی ترقی کی جانب پیش رفت ہو سکتی ہے۔ پس مشابہ آئیڈیل دو ایسے نظریاتی معاشروں میں بھی ممکن ہے جن میں بعد المشرقین ہو جیسا کہ استعمار پسندوں اور حریت پرستوں کے مابین۔

بنی نوع انسان کے آئیڈیل، نظریہ حیات بلکہ معاشرتی نظام اور تاریخی ادوار سے بھی ماورا ہوتے ہیں۔ وہ دراصل انسانیت کے سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور انسان کے اندر جاودانی اخلاقی اقدار کی ترغیب کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جبر و استبداد سے رہائی، تکمیل انسانیت کے لئے ارتقائی منازل، انصاف، حق کی تلاش، خودشناسی، انفرادی مفاد پر

اجتماعی مفاد کی فوقیت، کام کی قدر، شائستگی اور کارناموں کے مابین تناسب، طاقت کی نفی، جنگ کا خاتمہ، استحصال اور غلامی کا سدباب، جہالت اور کمزوری کا انسداد، جان کی ضمانت، اور ترقی کے جائز مواقع کی فراہمی، طبقاتی کشمکش کا خاتمہ، نسلی اور دیگر گروہی امتیازات کی روک تھام، ناجائز معاشی یا اخلاقی یا معاشرتی دباؤ کے خلاف جدوجہد وغیرہ ـــــ یہ سب کے سب انسانیت کے آئیڈیل ہی تو ہیں کہ انسانی تاریخ اور معاشری زندگی میں، آزاد اور انسانیت دوست لوگوں کے نعروں کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ یہ تک کہا جاسکتا ہے کہ اپنے عام مفہوم میں وہی انسیات کے اصلی اور حقیقی اصولوں سے عبارت ہیں اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے مختلف فکری نظام آئیڈیل کی تعبیر و تفسیر کرتے ہوئے اور خاص طور پر ان کی تکمیل کے ذرائع کے سلسلہ میں اپنی اپنی الگ راہوں کا تعین کر لیتے ہیں اور جداگانہ مکاتب کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ اس طرح کہ مذاہب مبدء کائنات سے انسانیت کو ہمکنار کرنے کی خاطر، فلاسفہ، زندگی کے نئے عقل پر مبنی قوانین کے انکشاف کے ذریعہ۔ مغربی بورژوائی لبرل مکتب، مادی پیداوار کے میدان میں فرد کی آزادانہ اور مسابقت پر مبنی مساعی کے ذریعہ جو اقتدار کے حصول نیز ترقی کی جانب پیش رفت اور سائنس کی ارتقاء پر منتج ہوں۔ مارکسیت سے بھی کچھ اسی قسم کے نتائج کا ظہور مقصود ہوتا ہے لیکن محکمت کی طبقیت اور حاکمیت کے ذریعہ۔ تصوف روحانی ارتقاء، ذہنی آسودگی، اور طبعی احتیاجات سے روح کی گلوخلاصی کی خاطر اپنی ذات کی پرداخت کو مرکز توجہ بناتا ہے۔ نظریت اس کے برعکس فطرت کے طریقوں کی متابعت اور احتیاجات کی تکمیل کے ذریعہ اپنے آئیڈیل کو پانے کی کوشش ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت، ہندومت، ہیگل کی تصوریت

اور مارکس کی جدلیات اور دوسرے مکاتب، بنی نوع انسان کے ابدی آئیڈیل کی تکمیل کے لئے کونسی راہ اور طریقے اختیار کرتے ہیں۔

اس قسم کے سوالات جب پیدا ہی ہوتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے صراحت کے ساتھ اس کا اعلان کر دینا چاہیے کہ بعض لوگوں کے تصور کے برخلاف جو اسلام اور مارکس کے کمیونزم میں قدر مشترک کی تلاش کرتے ہیں، اسلام اور کمیونزم اپنی اپنی جگہ ایک مکمل اور بھرپور آئیڈیالوجی کی حیثیت کے حامل ہیں اور ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔

اس ادعا کے ثبوت میں ہم اول تو اسی پہلو کو لیتے ہیں جس کی بنا پر خیال کر لیا جاتا ہے کہ دونوں میں یک گونہ مشابہت ہے۔ اس تسامح کی سب سے بڑی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ہر دو کی حیثیت ایک مکمل اور ہمہ گیر آئیڈیالوجی کی ہے۔ اس کے برعکس دوسری ہر ایک آئیڈیالوجی جزئی ہے یعنی بیشتر انسانی عمل و کردار کے کسی ایک رخ کو احاطہ کئے ہوئے ہے مثلاً مادیت اور فطریت کہ ان کی حیثیت محض فلسفہ کی ہے اور حیات انسانی کے دوسرے تمام پہلو یعنی سیاست، معیشت، اخلاقیات، عمرانیات، بشریات اور تاریخ کے معاملہ میں اپنے متبعین کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ دائیں بازو سے تعلق رکھیں یا بائیں سے۔ تاریخ کی سائنٹفک بنیاد پر یقین رکھیں اور ایک خاص اسلوب و قانون کے پابند ہوں یا غیر سائنٹفک اور قانون و اسلوب سے اپنے آپ کو بے نیاز گردانیں وہ انسان کو ایک "موجود بالذات" ہستی خیال کریں یا ایک مخصوص طینت کا حامل یعنی ابتدا پیدائش، اور فطرت اور ثقافت کی پیداوار۔

یہی کچھ وجودیت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے یہاں تک کہ ایک وجودیت کا قائل مذہب اور خدائی وجود پر ایمان بھی رکھ سکتا ہے یا مادی اور ملحد ہو سکتا ہے یا طرفداری

پر عمل پیرا۔ قومیت کا انحصار تو کسی قوم کی سیاسی آزادی اور اس کی ثقافت سے مربوط بخشنے کا نام ہے، لیکن ایک قوم پرست، مادیت یا تصوریت میں سے کسی ایک پر یقین رکھ سکتا ہے حتیٰ کہ خدا پرست یا ملحد اور فاشیت پہ جان دیتا ہو یا جمہوریت کا دلدادہ بھی۔

مذاہب کا بھی یہی حال ہے جن کی بنیاد اس امر پہ ہے کہ غیب اور مقدس کے ساتھ انسان کا رشتہ کیا ہے چنانچہ ان کے تمام تر احکام اور قوانین اسی بنیاد کے آئینہ دار ہوتے ہیں یا پھر اخلاقی اقدار کی تلقین سے وابستہ ہیں جن سے خاص اس مذہب کے پیروؤں کی زندگی اور کردار و نوعیت کے ذریعہ اس کا تحفظ ہو سکے۔

البتہ اسلام اور مارکسیت کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ دونوں اپنی اپنی آئیڈیالوجی رکھتے ہیں جو فرد کی حیات و فکر کی تمام جہتوں پر محیط ہے یعنی وجود کائنات کے بارے میں ہر ایک کا اپنا خصوصی نقطۂ نظر ہے، ایک خاص ضابطۂ اخلاق ہے، ایک خاص معاشرتی نظام ہے، مستقبل اور تاریخ کے بارے میں ان کا اپنا اپنا فلسفہ ہے، انسان کی شخصیت و ماہیت کو ہر ایک اپنے انداز میں سمجھتا اور پھر اسی اندازِ فہم کو عمومیت بخشنے کے ذرائع بھی ہر ایک کے اپنے ہیں، ہر ایک کو اس عالم اور معاشرہ میں لوگوں کی نجی زندگی تک سے سروکار ہے غرضیکہ مذکورہ بالا تمام جہتوں سے غور کیا جائے تو اسلام اور مارکسیت بالکلیہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کونیات[1] اور وجودیات[2] کے تعلق سے اسلام اور مارکسیت کی ٹکر

---

[1] : کونیات۔ COSMOLOGY
شریعتی نے اپنے متن میں "جہان شناسی" ترجمہ کیا ہے (مترجم)

[2] : وجودیت۔ ONTOLOGY
شریعتی کی اصطلاح میں یہ "وجود شناسی" ہے۔ (مترجم)

اساس قطعاً ایک دوسرے کی متناقض ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مارکسیت کی بنیاد مادیت پر استوار ہے اور اپنی عمرانیات بشریات نیز اخلاق و فلسفۂ حیات کو مادیت ہی سے اخذ کرتی ہے۔ مارکسیت کی کونیات جو کہ تمام تر مادی کونیات ہے بخود بقول مارکس "سنگدل و بے رحم" کونیات ہے جس میں "کسی حقیقی منتہا کا فقدان ہے" ٹھیک اس کے برعکس اسلام کی کونیات کا مدار ایمان بالغیب پر ہے اور "غیب" سے مراد وہ نامعلوم حقیقت مطلقہ و قاہرہ جو ہماری آنکھوں سے اوجھل اور مادی اور فطری مظاہر کے پس پردہ ہمارے عقلی و حکمیاتی نیز تجربی حواس و ادراک سے ماورا اور ان کی دسترس سے باہر ہے اور وہی حقیقت برتر اس دنیا کے تمام محرکات و نوامیس اور مظاہر کا مرکزی نقطہ بھی ہے۔

اس ایمان بالغیب کو قرآن نے اپنے آغاز ہی میں سورۂ بقرہ میں "ہدایت" اور اصل تقویٰ" کی حیثیت سے پیش کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

الم ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنھم ینفقون [1]

یہ غیب درحقیقت وجود کائنات کی روح وارادۂ مطلق ہے۔ تصوریت کے برخلاف جو مادی دنیا کے مظاہر کو "تصور" کے آفریدہ یا مادیت کے برعکس جو خود "تصور" کو بھی عالم مادی کا زائیدہ خیال کرتے ہیں، اسلام کے نزدیک "تصور" اور "مادہ" دونوں ہی اس مطلق ذات غیب کی دو مختلف آیات (نشانیاں) ہیں اس طرح وہ "مادیت" اور

---

[1] القرآن۔ آیت ۲ ۔ سورۃ ۲

تصوریت، سرود کی نفی کر دیتا ہے چنانچہ اس عالم طبیعی کے وجود کو تصور سے الگ اور پھر انسان کو ایک ایسی ہستی بھی قرار دیتا ہے جس میں تصور کی مستقلاً کارفرمائی ہے جس کا آزادانہ اور اصالتاً وجود ہے نیز عالم فطرت، مادی معاشرہ اور مادی پیدائش کے ساتھ مربوط و وابستہ ہے۔

مارکس، فیورباخ اور انسیات جدیدہ کے دوسرے زعما کی تقلید میں اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ انسانیت کو اقتصادی غلامی اور سیاسی و فکری از خود بیگانگی سے رہائی دلا دے اور تحلیل و تجزیہ پر مبنی اختصاص کا خاتمہ کر کے انسان کی وحدت کو بحال کر دے پھر جیسا کہ خود کہتا ہے "انسانیت کو اقدار انسانی، خلاقیت اور حاکمیت ذات" کی طرف لوٹا دے۔ گویا اس طرح اس کو "خود آگاہی" و "خود شناسی" سے متصف کر کے ہر قسم کے جور و جبر سے آزاد کر دے مارکس کو اپنی کائنات میں مادہ کے سوا یا مادہ ہی کی اندھی نا خود شناس کشمکش کے سوا کسی اور عنصر کا سراغ نہیں ملتا لہٰذا وہ لازماً انسانیت کو جسے اپنی آئیڈیالوجی میں اس قدر بلند مقام پر فائز کرتا ہے مجبوراً مادیت کے اسی اندھے کنویں میں دھکیل دیتا ہے اور اپنے مختتم تجزیہ میں انسان کو بھی اس عالم موجودات کی ایک "شے" بنا کر رکھ دیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مارکس بھی اسی تناقض کا شکار ہے جس میں یا اور دوسرے مادی مفکرین جو "انسیات" کے دفاع کے خبط میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ کائنات میں صرف ایک ہی اصول یعنی مادہ کی کارفرمائی ہے۔ پھر انسیات پر یقین رکھنے والوں کی حیثیت سے مایوسی کے عالم میں ایک دوسرے "اصول" کی بیجا تلاش کرتے کرتے "انسان" کے وجود کا بھی اعتراف کر لیتے ہیں۔ اولاً تو کائنات میں صرف ایک ہی اصول کی کارفرمائی کے قائل ہوتے ہوئے وہ "وحدیت" پر یقین رکھتے تھے اور اب "اصالت انسان" کو تسلیم

کرے وہ ایک "ثنویت" کے معترف ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک ہی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ مادیت پر بھی یقین رکھے پھر انسان کو مادی اشیاء سے علیحدہ کر کے اسے اصالت اور آزادی کے مقام پر بھی فائز کرے۔

لیکن تصوریت پسند جو انسان کی اصالت اور انسیات کے حامی ہیں وہ ایک اور ہی نوعیت کی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ عالم خارج کی واقعیت سے انکار اور جیسا کچھ بھی وہ ہمیں دکھائی دیتا ہے اس کی نفی کرتے اور تصور یا انسان کو جو مدرک ہے، اولیت کا مقام عطا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح انسان کی اصالت مستحکم ہو جاتی ہے تاہم عالم مادی کی واقعیت سے اور سائنس سے جو تصور اور واقعیت کے مابین ایک رابطہ ہے، انکار کے نتیجہ میں اولیت کے حامل انسان کو تو ایک طرف اٹھا رکھتے ہیں اور سارا زور "ذہن" پر ہے جس کو مجرد طور پر اسی عالم واقعی سے حاصل کر کے ایک مالیخولیائی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں اساسی طور پر حق و باطل کے مابین، علم اور جہل کے مابین، خیر و شر کے مابین اور واقعی اور خیالی کے مابین تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ گویا آخر کار زمانۂ قدیم کے سوفسطائیوں کی طرح "خود مرکزی" کی گود میں پناہ لیتے ہیں پھر "انسیات" کیا واقعتاً "خود مرکزی" سے زیادہ بھی کچھ ہو سکتی ہے؟

پس مارکس کی "انسیات" میں انسان بالآخر ایک "شے" اور تصوریت کی انسیات میں "ایک ذہن" بن جاتا ہے۔ البتہ اسلام توحید کے ذریعہ نہ صرف عالم فطرت، خدا اور انسان کے مابین تضاد کے مسئلہ کو حل کر دیتا ہے بلکہ اس حقیقت کے خلاقیہ اظہار کے ذریعہ انسان کی موضوعی حیثیت اور ساری عالم فطرت ہر دو ایک ہی ذات یکتا کی آیات اور تجلیات بن جاتی ہیں جو ہر چند کہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں بحیثیت "تصور" اور "مادہ"

یا "انسان" اور "عالم فطرت" کا باہمی تضاد یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ اسلام انسان کی اصل حقیقت اور مادی واقعیت کو ایک دوسرے سے مختلف دو اصول گردانتا ہے۔ ان کے مابین ایک پیچیدہ اساسی اور وجودی رابطہ کو برقرار بھی رکھتا ہے اور دونوں کو وجود کے ایک ہی مبداء سے سرشار خیال کرتا ہے۔

"از خود بیگانگی" کا خیال خام جسے مارکس نے فیور باخ سے مستعار لیا ہے اور اس پر اتنا زیادہ انحصار کیا ہے نہ صرف یہ کہ اسلام پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ معاملہ میں اس کے برعکس ہے کیونکہ "خدا کے حضور میں انسان کی از خود بیگانگی" "نفس کے تعلق سے انسان کی خود آگاہی" میں بدل جاتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے اگر ہم فیور باخ اور مارکس کے استدلال پر مکرر غور کریں تو ان کے استنباط کو رد کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ "یہ کہ خدا انسان کا ساختہ ہے، خدا انسان کی فطرت کا جلوہ ہے۔ انسان اپنی تمام اقدار اور قواء کو جو اس کی ذات میں ہی خود بخود آسمان کے سپرد کر دیتا اور ایک ماورائی وجود کو جسے وہ خدا کا نام دیتا ہے پرستش و عبادت کا مرکز بنا لیتا ہے۔ گویا فی الحقیقت جو کچھ اس کا اپنا ہے اور اسی کی ذات کے اندر ہے اسے اس معبود سے منسوب کر دیتا ہے۔"

ہم اپنے مذکورہ بالا موقف کی پذیرائی کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "از خود بیگانگی" کے خیال کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے اس طرح کہ اس صورت میں "خدا خود انسان" کا مترادف ہو جاتا ہے۔ نیز خدا کی پرستش، انسان کی پرستش بن جاتی ہے اور خدا کے وسیلہ سے انسان کی "از خود بیگانگی" کی تحویل خود انسان ہی کے وسیلہ سے انسان کی "از خود بیگانگی" میں بدل جاتی ہے۔ کیا انسان کی "اپنے ہی نفس سے آگاہی" یا "انسان کی خود آگاہی" دوسرے الفاظ میں "انسیات" ہی نہیں؟ اس بنا پر "خدا پرستی" اس مادی کائنات میں ایک لیسے

مذہب سے عبارت ہوگی جس میں انسان ایک عشق کے متوالے کی طرح اپنی ہی ماورائی اور اعلیٰ تر و مقدس اقدار کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ اس مادی کائنات میں جہاں ہر آن مادیت اور اخلاق و اقدارِ عالیہ کا انحطاط اور حیوانی سطح تک پستی اس کو للکارتے رہتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ کس طرح مذہب پر مارکس کے شدید ترین حملہ میں اس کی "منطق" اس کے اپنے ہی اخذ کردہ نتائج کو الٹ کر رکھ دیتی ہے چنانچہ "خدا کی عبادت" کے شعوری حالت میں درجۂ کمال تک پہنچنے سے نہ صرف یہ کہ انسان کی اصالت کی نفی نہیں ہوتی اور وہ از خود بیگانہ نہیں ہو جاتا بلکہ خدا کی حمد و عبادت خود انسان کو اس کی اصالت اور اقدارِ انسانی کو ان کا تقدس بخشتی ہے اور اس طرح "ایک بامعنی، متعین اور اعلیٰ تر انسیات" پروان چڑھتی ہے اور یہ نتیجہ آفرینی صد فیصد اسلامی ہے۔

کیتھولک مذہب اور تصوف کے نقطۂ نظر سے خدا اور انسان کے مابین ایک حریفانہ تعلق پایا جاتا ہے یعنی 'بقا' کے بالمقابل 'فنا' پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ وہ انسان کو جبرِ الٰہی کے آگے مجبورِ محض جانتے ہیں لیکن فی الحقیقت اس کے برخلاف اسلام میں "اصول تفویض" یعنی بنی نوع انسان کو خدا کی جانب سے ارادہ کی آزادی اور اپنے عمل اور مقدر پر اختیار مل جانے کی بدولت انسان نہ صرف جبرِ باری سے بلکہ جبرِ الٰہی کے بندھنوں سے بھی رہائی پا لیتا ہے حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہشت خداوندی میں آدم حکم الٰہی کی سرتابی کا بھی مرتکب ہو جاتا ہے۔ ارادہ کی اسی آزادی اور خود مختاری کی بنا پر جو انسان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے وہ اس دنیا میں خدا کے نائب اور جانشین کے رتبہ پر فائز ہوتا ہے۔

بس خدائی مقام پر پہنچ کر انسان فرشتوں کا مسجود بن جاتا ہے اور عالم فطرت کی

طاقتیں اس کے لئے مسخر کر دی جاتی ہیں لیکن مادیئین کی پست ذہنیت اور ان کے تصورات کی تنگنائے میں یہ بات بالکل نہیں آسکتی، ہر چند کہ مارکس کی تعبیر کے مطابق ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان کو خدا بنا دیں۔

اسلام کی جہان بینی[1] انسان کو اس عالم موجودات میں ایک حکمران ارادہ کا مالک بنا دیتی ہے اور اس لحاظ سے وہ خدائے فطرت کہلانے کا مستحق ہے اور خدا کے تعلق سے اس کی نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے۔

مارکس جس چیز کو فلاکت دینی کا نام دیتا ہے وہ ان تصورات کے لئے کس قدر اجنبی ہے جس سے قرآن کے متن کی تشکیل ہوتی ہے؟ جس بات نے مارکس کو یہ راستہ سجھایا کہ وہ "خدا سے تنفر" کا اظہار کرے، دراصل عبادت و اطاعت کا وہ اصول ہے جو انسان اور خدا کے مابین تعلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ مارکس کے تصور کے برخلاف، جو اس اصول کا استنباط جاہل اور توہم پرست عوام کے پیش پا افتادہ اور عامیانہ طریقوں کو دیکھ کر کرتا ہے اور اسے از خود بیگانگی یا ذلت و خواری اور فلاکت کا مظہر خیال کرتا ہے —— لیکن اسلام اس کو انسان کے اندر صفات الٰہیہ کے پروان چڑھنے اور درجۂ کمال تک پہنچنے سے تعبیر کرتا ہے۔

فلسفۂ اسلام میں خدا اور بندہ کے مابین ایک باہمی تعلق ہے جس میں "خود شناسی،

---

[1] : جہاں بینی۔ WORLD VIEW

ہم نے شریعتی کی اس اصطلاح کو برقرار رکھا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ اردو زبان میں رائج کئے جانے کی مستحق ہے۔ (مترجم)

خدا شناسی" کے مترادف بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اوّل الذکر ثانی الذکر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ یہاں ہم اس مشہور ایرانی صوفی بایزید بسطامی کا معرفت و روحانیت سے بھرپور قول نقل کرتے ہیں کہ "برسوں میں خدا کی تلاش کرتا رہا اور ہر مرتبہ اپنے آپ ہی کو پایا اب اپنی تلاش کرتا ہوں تو خدا ہی کو پاتا ہوں"۔

فیورباخ اور مارکس کے خیالات کے بالکل برخلاف یہ انسان نہیں جو خدا کا خالق ہے یا جس نے اپنی خاص اقدار کو اس سے منسوب کر دیا ہو اور پھر اس کی عبادت کرنے لگا ہو بلکہ یہ خدا ہے جو انسان کا خالق ہے اور اپنی صفات الہیہ کو اس میں ودیعت کر کے اس ستائش کرتا ہے۔ مارکس نے اگر خدا کے تئیں انسان کی از خود بیگانگی پر بحث کرنے کی بجائے بنی نوع انسان کے مقابلہ میں خدا کی "از خود بیگانگی" کو موضوع بنایا ہوتا تو کم از کم یہ فلسفیانہ طنز بڑا ہی دلچسپ ہوتا۔

ہم اس وقت دراصل مذہب اور مادیت یا اسلام اور جدلیاتی مادیت کے مابین تناقض پر گفتگو نہیں کر رہے ہیں بلکہ اصل مسئلہ تو "انسانیت" کا ہے کیونکہ ہر آئیڈیالوجی خواہ مذہبی ہو کہ خلاف مذہب، ناگزیر طور پر انسان ہی کے محور کے اطراف گھومتی ہے اور فی التحقیق اسی مسئلہ پر مارکسیت اور اسلام کے مابین وسیع ترین خلیج حائل ہے اور یہ بڑھتا ہوا فاصلہ دراصل ہر ایک کی اپنی آئیڈیالوجی کے تصورات جہاں بینی کے درمیان تضاد کا فطری ہے جن سے ان کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ان کی ہر توجیہہ و تعبیر کی اساس بن جاتے ہیں وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور مارکسیت میں سیاست و معیشت، اخلاق و معاشرت غرضیکہ ہر میدان میں ایک دوسرے کے ساتھ عدم توافق کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ اسلام تو انسان کی تفسیر و تعبیر "توحید" کی اساس پر کرتا ہے اور مارکسیت بھی

کچھ "پیدائش دولت" کی اساس پر کرتی ہے۔

مارکس بلاشبہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ وہ تمام اخلاقی اقدار اور انسان کی د "انسانی صفات" کہ مارکس اپنی تحریروں میں بڑے زور و شور سے جن کے گن گاتا ہے، ا طرح انہیں یک لخت پامال بھی کر دیتا ہے چنانچہ انسان کے اندر جن اخلاقی اقدار کی افزائش ہوتی ہے یا جن سے انسان متصف ہوتا ہے مارکس بیک جنبش قلم ان کی تحویل "افزا پیدائش" میں کر دیتا ہے اور یوں مارکس کی "اصالت انسان" "اصالت افزار" کا قالب اختیار کر لیتی ہے کیونکہ محدود و تنگ نظر اور ذہنی طور پر افلاس زدہ مادیت کے تصور، جہاں بنی میں "پیدائش دولت" سے بڑھ کر کوئی اور عنصر قابل قدر نہیں، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کیا بحیثیت آئیڈیالوجی اور کیا بحیثیت اس کے عملی اطلاق کے، مارکس کی یہ کوشش کہ اعلیٰ ترین اقدار اور اخلاقی نصب العین کا سہارا لے کر اپنے کمیونزم کا جواز پیش کرے اور اس کو "انسیات" کے تحقق کا اصلی مظہر ثابت کرے، محض معیشت کی اساس پر جلد ہی اپنے کمیونزم کی قلب ماہیت "اقتصادیت" میں کر دیتی ہے۔

اس بنا پر اگر اسٹالن اپنی "استالینزم"[1] اپنی معیشت پرستی اور افزائش پیداوار کے جنون میں مارکس کے بتائے ہوئے راستہ سے دور جا چکا تھا جس کا الزام اسے دیا جاتا ہے تو لینن کے بارے میں کسی ایسی الزام تراشی کی گنجائش نہیں بلکہ بالاتفاق سب ہی مستند محققین کی یہ رائے ہے کہ لینن تو مارکس کی حکمت عملی پر بڑے خلوص اور صدق دل سے عمل پیرا رہا ہے لیکن یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں کہ سوویٹ انقلاب کے ابتدائی چند برسوں

[1] : استیالینزم STALINISM

میں ہی لینن بھی بھاری صنعتوں کو انقلاب کا سنگ بنیاد خیال کرتا دکھائی دیتا ہے اور اس طرح "معاشی فراوانی" مارکس کے "مثالی معاشرہ" کے استقلال واستقرار کی اولین شرط قرار پاتی ہے جو کمیونزم کا آخری نصب العین ہے پھر اس مقصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل تین اصولوں پر کاربند ہونے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔

۱۔ بھاری صنعتوں کے قیام پر بیشتر انحصار تاکہ جلد از جلد صنعتی انقلاب رونما ہو۔

۲۔ ہمہ گیر منصوبہ بندی جس کے ذریعہ معاشرہ کے تمام افراد کی زندگیاں، بیوروکریسی اور فنی ماہرین کی مساعی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے لینن خود مشورہ دیتا ہے کہ سرمایہ داری کی تقلید کرنی چاہیئے۔

۳۔ افزائش پیداوار کی خاطر مسابقت کے ذرائع کی تلاش اور اس مسابقت کی بنیاد پر ذاتی وگروہی مساعی میں ایسی نفع طلبی کہ بالآخر اجرتوں میں عدم مساوات نیز انعامات کے ذریعہ اور فنی مہارت، پیشہ ورانہ استعداد اور تنظیمی صلاحیتوں کے متوازن ومتناسب معاوضوں کی شکل میں خصوصی محرکات کے رواج سے جس کی تحریک ہو۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بہت سارے ادیبوں نے جن میں ایک کثیر تعداد خود کمیونسٹوں کی ہے جس "استالینی معیشت" کو ہدف تنقید بنایا ہے وہ لینن ہی کی پالیسیوں پر مشتمل تھی پھر اس نکتہ کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ لینن خود بھی اسی منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا رہا تھا جس کا ایک "مثالی معاشرہ" کی تعمیر کے لئے مارکس اور اینجلز نے اعلان کیا تھا۔

لیکن یہ بات کس قدر تعجب خیز ہے کہ کرائی زندگی کے لئے مارکس کا "اصول انصاف ومساوات" کلیتاً ایسے عناصر کے ساتھ مشروط اور ان کا تابع ہے جو سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی ثقافت اور مغرب ہی کے معیار اخلاق سے مستعار لئے گئے ہیں یعنی ۱: میکانیت

۲: فنی و بیوروکریسی کا نظام ۳: مادی فراوانی ۴: اقتصادی مسابقت ۵: ذاتی و انفرادی جلبِ منفعت۔ اس طرح بیش از بیش مادی خوشحالی ہی نہائی غایت و نصب العین بن جاتے ہیں !!

ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر فلسفۂ حیات کے نقطۂ نظر سے مارکسیت اور بورژوائیت میں وہ کون سا بنیادی فرق ہے؟ مختصر طور پر جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اصل فرق صرف نظامِ معیشت کے اس اصول میں پنہاں ہے کہ "سرمایہ ایک ہی طبقہ کے ہاتھوں میں" اور "سرمایہ پر مملکت کا مکمل اختیار"۔ گویا فرق دو فلسفوں یا زندگی یا انسانیت یا اخلاقی اقدار یا کائنات کے بارے میں دو مختلف تصورات کا نہیں۔

اسی کے بموجب اگر ہم یہ استنباط کریں کہ مطمحِ نظر کے اعتبار سے بھی، مارکسیت جہاں بینی اور بشریات اور اخلاقیات میں بورژوائیت کی ہم خیال ہے اور یہ کہ جہاں تک مارکسیت، مغربی بورژوائیت ہی میں پروان چڑھی ہے اور اپنے دور کے زریں نتائج کی لازمی پیداوار ہے تو یہ ناگزیر ہے کہ مارکسیت میں بھی اپنے حریف یعنی مغربی بورژوائیت کا مقصدِ حیات اور وہی ذہنیت اور روح کارفرما ہو جب صورتحال یہ ہے تو کیا ہم اپنے استنباط میں کسی ناانصافی کے مرتکب ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ مارکس اس کا اعتراف کرتا ہے کہ مغربی بورژوائیت، محض اقتصادی نظام کی ایک قسم ہی نہیں بلکہ ایک خاص ذہنیت اور اخلاقیات کی بھی حامل ہے۔ نیز دونوں کا "مطمحِ نظر" بشریات و فلسفۂ حیات یکساں ہے اسی نظریہ کے تحت جس میں انسان کے اعلیٰ تر خصائل پر ادنیٰ تر مادی زندگی اور اس کی ذہنیت کے غلبہ کو ترجیح دی جاتی ہے اور سارے روحانی محرکات معطل ہو جاتے ہیں پھر مارکسیت، انسان کو ایسی ہستی بنا کر پیش کرتی ہے کہ جو شخص بھی زیادہ کام کر سکے، زیادہ

چالبازی سے کام لے سکے، اور جنگ کی صورت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے اس کو ہر ایک سے زیادہ کھانے کا بھی حق ہے۔

لہذا جیسا کہ پروفیسر گرمبرٹ[1] کہتا ہے، کیا مارکسیت کی ساری کد و کاوش یہ نہیں کہ ایک "بورژروائیت زدہ" معاشرہ کی بنیاد ڈالے یعنی مارکسیت اور مغربی بورژروائیت میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر تو "ایک طبقہ" پر مشتمل بورژروائیت اور ثانی الذکر "ایک معاشرہ" کی بورژروائیت کا درس دیتی ہے۔

سینٹ سائمن[2] جو "صنعت پرستی"[3] کے مذہب کا بانی ہے۔ معاشرہ کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جسے وہ صنعتی طبقہ کا نام دیتا ہے اور پیدائش دولت میں اہم کردار ادا کرتا ہے یعنی کاریگروں اور مزدوروں، انجینئروں، کارخانوں کے منتظمین اور سرمایہ داروں کا طبقہ۔ دوسرا طبقہ ان نکھٹوؤں پر مشتمل ہے جو صارفین ہیں اور صرف کرنا ہی جانتے ہیں اور پیدائش دولت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مثلاً مفکر، ادیب، آرٹسٹ مذہبی پیشوا، فلسفی، ہیرو، مدبر، ورزش کرنے والے، سپاہی اور اسی قبیل کے لوگ۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مادی پیداوار کی پرستش میں یہ غلو حتیٰ کہ مزدور و سرمایہ دار کو ایک ہی طبقہ میں شامل کر دینا ایک فکری و ذہنی انتہا پسندی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی ایک ایسے طبقہ میں جس کا ٹکراؤ معاشرہ کی روحانی و ثقافتی قوتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ

۱؎ : گرمبرٹ GRIMBERT

۲؎ : سینٹ سائمن SAINT SIMON

۳؎ : اس کے قطع نظر کہ مارکس کے بنیادی نقطۂ نگاہ کی رو سے اس کے معاشری طبقات ایک حتمی و قطعی حیثیت رکھتے ہیں، اس کا فلسفۂ تاریخ و عمرانیات سینٹ سائمن ہی سے ماخوذ ہے۔

ہیں اور مارکسیت میں، عمرانیات کے اعتبار سے بظاہر تضاد کے باوجود بلحاظ اپنی فلسفیانہ رُوح اور جوہر انسانی کے، ایک دوسرے کے ساتھ گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ کمیونسٹ چین میں وہ چھوٹی سے چھوٹی فولادی بھٹیاں جو ملک کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں قائم ہوئی تھیں، انہیں انقلاب کا نشان قرار دے دیا گیا ہے اور عوام کی مقدس بھٹیوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ سوویٹ روس کے ایک بزرگ ادیب نے "سیمنٹ پرستی کا دین" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو اسی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب کی رو سے انسانی تمدن، ثقافت اور فلاح کی ذمہ داری اب خدا، اخلاق، فلسفہ، سائنس وغیرہ سے منتقل ہو کر سیمنٹ کے حصہ میں آگئی۔

اس موقع پر برمحل معلوم ہوتا ہے کہ لینن اور اینجلز کے ایک ہم عصر نیز مارکس کے انتہائی معتقد اور مارکسیت کے ممتاز ترین مفکرین میں سے ایک کی رائے نقل کر دی جائے۔ "جدید اشتراکیت کا چہرہ" نامی اپنی کتاب میں وہ رقمطراز ہے کہ "مارکسیت پیداآوری ہی کا نام ہے اس پیمانہ سے ناپا جائے تو پھر امریکی نظام سرمایہ داری کو زیادہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے تحقیقی اور مسلمہ تجربہ کی بنا پر اور اعداد و شمار کی روشنی میں خود کو مارکسیت سے برتر خیال کرے۔

تاہم جو بنیادی مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بن کر کھٹکتا ہے وہ یہ ہے کہ "اصالت انسان" یا انسان کی اولیت جس پر مارکس بورژوائیت سے معرکہ آرائی کے دوران اس قدر تکیہ کرتا ہے۔ پیدائش دولت کی اولیت سے کس طرح اس کا ظہور و صدور ہوتا ہے اور اس کی "انسیات" کیونکر رائج العصر اقتصادیت میں تحویل پا جاتی ہے؟

ہم نے دیکھا کہ جوں جوں ہم مارکس کے فلسفہ کی روح اور اس کے ظاہر سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، "مشترک آفاقی آئیڈیل" جو تمام تر بشری ہیں، اسلامی فلسفہ کی روح سے اسی

قدر دور ہونے لگتے ہیں اور اسلام و مارکسیت کی الگ الگ راہیں متعین ہو جاتی ہیں۔

اسلام سیدھے سادے الفاظ میں "فلسفۂ فلاحِ انسانی" ہے۔ چنانچہ اپنے اولین پیغام و دعوت میں وہ اعلان کرتا ہے "قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا" یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ کہو اور فلاح پاؤ۔ اس طرح توحید کو فلاح کے حصول کا سب سے اہم اور ضروری وسیلہ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آغاز ہی سے "اسلامی انسیات" خود آگاہی کی طرف پہنچاتی ہے لیکن مارکسیت ایک اور نوع انسیات یعنی "پیدائش دولت" کی جانب لے جاتی ہے تو کیا ایسی صورت میں اسلام ایک صوفیانہ اور زاہدانہ آئیڈیل کی طرف رہبری کرتا ہے جس کو واقعیت کے ساتھ کوئی سروکار نہیں؟ اور کیا اسلام نے بھی دوسرے صوفیانہ اور روحانی فلسفوں کی طرح "عدل" کو فراموش کر دیا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں۔ اسلام معاشی مرفہ الحالی اور معاشرتی عدل کو اپنی حیات اجتماعی کے اصول خیال کرتا اور انہیں جلا بھی دیتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ معیشت و عدالت کے اصول اسلام کی لازمی شرطیں بن جاتی ہیں اور بنی نوع انسان کو فقر و فاقہ اور ہر قسم کے امتیاز سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں تاکہ وہ اخلاقی اعتبار سے کاملیت اور نوعی ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا آزادانہ طور پر اپنی تخلیقی "فطرتِ خدائی" کا سراغ پالے۔ یہی اسلام میں فلسفۂ حیات انسانی کا اعلیٰ ترین اصول ہے۔

مارکسیت اور اسلام میں اخلاقی اقدارِ انسانی یا "انسیات" کی تعبیر و تاویل کے تعلق سے بھی اساسی فرق ہے۔

یہاں مارکسیت کے اس سب سے بڑے تناقض کی طرف جو غالباً نمایاں نہیں ہو پاتا۔ اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ یہ وہ تناقض ہے کہ ایک ہی فقرہ میں اس کو یوں بیان کر دیا جا سکتا ہے کہ "مارکسیت ہی مارکسیت کے راستہ میں سدِ راہ بن جاتی ہے۔" کیونکہ جس تناقض کی

جانب اشارہ کیا گیا ہے وہ افکار و احساسات کے نئے کشش پیدا کرنے میں مارکسیت کی کامیابی کا سب سے بڑا عنصر ثابت ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ یہی تناقض آئیڈیل کے تحقق کے معاملہ میں مارکسیت کی ناکامی میں بھی سب سے بڑے عامل کا کردار ادا کرتا ہے یعنی وہ آئیڈیل جس کا مارکسیت اعلان کرتی ہے ۔

بہت سارے معترضین نے جو اس تناقض کی تحلیل و تجزیہ سے ناآشنا تھے، انہیں اب اس کا تکلیف دہ احساس ہونے لگا ہے ۔ اور اس کی سیدھی سادھی توجیہ ان کے پاس یہ ہے کہ مارکسیت کے مکتب فکر اور کمیونسٹ حکومتوں کے مابین اساسی فرق کو تسلیم کرلیں گویا موضوعی مارکسیت کو معروضی مارکسیت سے علیحدہ کرلیں اور کمیونسٹ حکومتوں کے بارے میں یہ خیال کر لیں کہ وہ اصل مارکسی اصولوں سے منحرف ہو چکے ہیں پھر یہ بتلانے کی کوشش کریں کہ اسی سبب سے یہ حکومتیں، مارکس کے دیکھے ہوئے خواب کے مطابق مارکسیت کے اولین مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہی ہیں۔ پس ان معترضین نے اس تناقض کو اپنے تئیں اس طرح حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ دشنام طرازی اور الزام تراشی پر اتر آئیں۔ لہٰذا "اصلاح پسندی[1]" "شخصیت پرستی[2]" "قوم پرستی[3]" "تعاون پسندی[4]" "سازشوں کی کارفرمائی[5]" "ٹیٹو ازم[6]" "اسٹالنزم[7]" اور "ماؤ ازم[8]" وغیرہ کی اصطلاحیں گھڑ لی گئیں۔

سچ تو یہ ہے کہ تضاد، خود آئیڈیالوجی کے ماخذ میں پنہاں ہے اور وہ ہے معتقد

۱؎ : REVISIONISM
۲؎ : PERSONALITY CULT
۳؎ : NATIONALISM
۴؎ : COLLABORATION
۵؎ : EMBOURGEOISEMENT
۶؎ : TITOISM
۷؎ : STALINISM
۸؎ : MAOISM

اور وسائل کا تضاد" یا دوسرے الفاظ میں مارکسی فلسفہ کے انسان اور مارکسی معاشرہ کے انسان کا تضاد"!

جب مارکس، انسان کے بارے میں اور بالخصوص ایک محقق اور عالم کی گیرائی و گہرائی کے ساتھ سرمایہ داری، بورژوائیت اور اس کی ثقافت، مغربی معاشرتی نظام اور مغربی صنعتی نظام کی موشگافی کرتا ہے نیز اس نظام میں قوائے انسانیت کے ضیاع پر سخت تنقید کے وار کرتا ہوا اسے ادھ موا کر دیتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ بنی نوع انسان کی آزادی کے تحفظ کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ پھر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ صوفیوں کے لہجہ میں ایک عارف یا افلاطونی فلسفی یا اخلاقیات کا معلم۔ یا یہ کہ روحانی پیشوا بول رہا ہے اور نجی ملکیت مزدوروں کی اجرت، قدرِ زر، مسابقت کے اصولوں وغیرہ پر مبنی سرمایہ دار حکومتوں کی مذمت کرتا ہے تو بیشتر انسان کے ایک جوہرِ اعلیٰ ہونے پر انحصار و اصرار کرتا ہے جسے اس نظام نے آلودہ کر کے انسان کے اعلیٰ اخلاق کو ادنیٰ اخلاق میں تبدیل کر دیا ہے

یہاں تک کہ مارکس انسانیت کے تعلق سے مادیت پر بھی بحث کرتا ہے تو اخلاقیات کے معلمین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کمیونزم کی بنیاد مادیت پر کیوں استوار ہونی چاہیئے۔ مادیت کو ان تمام صفات و خصوصیات سے متصف کر دیتا ہے جو بحیثیت مذہبی یا کم از کم فلسفۂ اخلاق سے منسوب ہیں اور عمرانیات کی نظر میں مارکسیت، تصوریت" ہی کا چربہ بن جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس بدیہی واقعہ کو جاننے کے لئے بہت زیادہ عقل و فہم درکار نہیں کہ ذاتی نیکی کے بارے میں مادیت کے اپنے نظریات، نیز تمام بنی نوع انسان میں سمجھ بوجھ کی یکساں صلاحیتوں کے اعتراف، تجربے کے وسیع تر و اعلیٰ تر مواقع کی فراہمی اور لذت اندوزی وغیرہ کے باب میں سارے انسانوں کے مساویانہ حقوق

کے تصور کو اپنانے اور اس سے مانوس ہونے کی بنا پر مادیت اور کمیونزم و اشتراکیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دوسری جگہ انسانیت کے دفاع اور پرولتاری طبقہ کی ستائش کرتے ہوئے وہ عیسائیت پر شدید حملے کرتا ہے لیکن لہجہ وہی ہے جو ایک عیسائی کا ہے حتیٰ کہ اسی زبان اور انہی الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو "اخلاقی تصوریت" یا "مذہبی اخلاقیات" میں مستعمل ہیں۔ مثلاً یہ بیان۔

"عیسائیت کے عمرانی اصول، بے غیرتی، حقارت، تذلیل، اطاعت، فروتنی غرضیکہ تمام گھٹیا صفات کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے برعکس پرولتاری طبقہ کو جس تحقیر و تذلیل کے برداشت کرنے سے انکار کرنے کے لئے، روٹی کی خواہش سے کہیں زیادہ شجاعت پسندی، احترام نفس، تفاخر اور حریت پسندی کے جذبات کو فروغ دینے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کیا یہ مارکس ہی ہے جو پرولتاری طبقہ کو بلندیوں تک پہنچا رہا ہے یا کوئی ژاں ژاک روسو[1] یا ارنسٹ رینان[2] یا جان اسٹورٹ مل[3] بول رہا ہے۔

آگے چل کر انسان کی "از خود بیگانگی" پر گفتگو کرتا ہے تو مارکس ایک انسانیت دوست روحانی بزرگ دکھائی دیتا ہے اور بنی نوع انسان کے مستقل، مقدس اور حقیقی جوہر کو "صفات حسنہ الٰہی کی یا اخلاقیات و ذاتی فطرت کا اصلی سرچشمہ قرار دیتا ہے جو تمام مخلوقات کے مقابلہ میں اشرف و اعلیٰ ہے چنانچہ وہ یوں رقمطراز ہے کہ "ایک مزدور اپنے آپ کو جس قدر بھی اپنے کام کے لئے وقف کر دیتا ہے، اسی قدر وہ دنیا جس کی تخلیق وہ خود کرتا ہے

---

[1] : ژاں ژاک روسو : JEAN TACQUES ROUSSEAU

[2] : ارنسٹ رینان ; EARNEST RENAN

[3] : جان اسٹورٹ مل : JOHN STUART MILL

زیادہ طاقتور بن جاتی ہے اور وہ اپنی داخلی دنیا میں اتنا ہی عاری اور تہی از خودی بن جاتا ہے۔ یہی کچھ مذہب پر بھی صادق آتا ہے یعنی انسان اپنے آپ کو جس قدر بھی خدا کے سپرد کر دیتا ہے اپنی ذات کے ساتھ اس کا تعلق اسی قدر کمزور ہوتا جاتا ہے۔" یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسان کو موضوع گفتگو بنانے میں مارکس بھی ایک داخلی اور خارجی دنیا اور خودی اور ماحول کو تسلیم کئے لیتا ہے لیکن یہ بات باعث دلچسپی ہے کہ وہ ہر دو کو ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے کا مخالف ٹھہراتا ہے۔

مارکس، جس طرح ایک "مستقل انسانیات" کا دفاع کرتا ہے وہ بھی قابل غور ہے وہ کہتا ہے کہ "انسانی جوہر" خدا، معاشرہ اور عالم فطرت کے مقابلہ میں ایک قائم بالذات حیثیت کا حامل ہے بلکہ مذہب پر حملہ آور ہوتے ہوئے انسان کے روحانی عروج کو وہ اس اس سے بھی بلند تر کر دیتا ہے اور انسان کو فی الحقیقت ان بلندیوں تک لے جاتا ہے جہاں وہ ایک مقدس وجود کا حامل اور اپنا آپ خالق ہو۔ اور خدا جو دراصل سامنے کے سارے ابدی اور مطلق اقدار اخلاق کا مظہر ہے اسے محض انسان کے ماورائی اور مقدس جوہر خودی کا پرتو شمار کرتا ہے۔

مارکس اور اینجلز نے بحیثیت مجموعی "انسان" کے موضوع پر جو کچھ بھی قلمبند کیا ہے اس سے یہی مترشح ہے کہ وہ انسان کو "صفات حسنہ" اور ابدی اقدار عالیہ" سے مملو خیال کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان ایک "آزاد، با اختیار، صاحب فکر، نیز تاریخ و معاشرہ یا اگر عالم فطرت میں کسی بھی مادی علت سے بالاتر علت مستقل ہے۔ وہ غیور، خوش خصال، صاحب شجاعت، حوصلہ مند، خلاقیت پر قادر، اخوت پسند، اپنے عقیدہ پر فدا ہونے والا۔ وہ شرف کے حصول میں احساس ذمہ داری سے سرشار اور آخر میں اپنے منتہا نیز اپنی سرشت کا خود ہی معمار

حتیٰ کہ اپنی قوم کے حق میں ایک پیغمبر و مسیحا اور نجات دہندہ ہے:

یہ فلسفی مارکس ہی ہے جو انسان کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ مارکس جس نے اپنی انسیات کی عمارت، مذہب، تصوف، فلسفۂ اخلاق اور بالخصوص سترہویں صدی کی انسیات اور اوائل انیسویں صدی کے جرمنی کی اخلاقی اشتراکیت سے براہ راست یا بالواسطہ اخذ کردہ عناصر پر کھڑی کی ہے۔ پس اور لوگوں کے علاوہ پیٹر٭ جیسے شخص کو سنجیدگی کے ساتھ یہ کہنا پڑا کہ فلسفی مارکس نے اس فلسفۂ انسیات کے باب میں جو کچھ کہا ہے وہ ایک صوفی منش یا روحانیات کے آدمی ہی کا بیان ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں، اگر کوئی برملا یہ کہہ دے کہ جو آدمی مارکس کے نزدیک اس حد تک مرکز ستائش و عبادت ہے وہ خدا ہی تو ہے البتہ روئے زمین پر دو پاؤں لئے گھوم رہا ہے۔

تاہم فلسفی مارکس جونہی اپنی بات ختم کرتا ہے ماہر عمرانیات مارکس اپنے ہی کاتے ہوئے سوت کو کپاس کر دیتا ہے۔ چنانچہ جس انسان کو اس نے عرش معلے پر بٹھا کر کائنات کی خلاقیت اور خدائی کبریائی عطا کر دی تھی۔ اسے خود ہی زمین کی پستیوں میں سر کے بل الٹا کر پھینک دیتا ہے۔ یہ خالق جس نے خدا کو اور تاریخ کو حتیٰ کہ خود اپنے آپ کو بھی پیدا کیا ہے اور اپنے لامحدود و خود آگاہ ارادۂ مطلق کے ذریعہ جہانِ موجودات میں جو چاہے جب اور جیسے تغیر و تبدل کر دیتا ہے، اچانک اقتصادی ابزار کار کی مخلوق بن جاتا ہے۔ ابزار کار جو خود بھی جدلیاتی مادیت کے تاریخی و جبری قوانین کی پیداوار ہیں۔ پس ابزار کار دو چیزیں پیدا کرتے ہیں ایک تو اشیاء اور دوسرے انسان!!

گویا یہ ماہر عمرانیات مارکس، یکایک، فلسفی مارکس کے "انسان بدل بہ خدا" کی قلب

٭: پیٹر۔ ANDRE PETER

ماہیت ایک "انسان مبدل بہ اشیاء" میں کر دیتا ہے۔ پھر وہ انسان کی ساخت و پرداخت کا اس انداز میں ذکر کرتا ہے جو فلسفی مارکس کو اگر خشم آلود نہ کر دے تو کم از کم وحشت میں مبتلا کرنے کے لیے ضرور کافی ہے۔ مارکس کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "اشتراکی انسان کے لیے ساری انسانی تاریخ میں سوائے انسان کی فطری ساخت کے ہر چیز کام ہی کی پیداوار ہے"۔

اینجلز نے بھی اپنے ایک مضمون "بندر کو انسان بنانے میں کام کا حصہ" میں یوں خامہ فرسائی کی ہے: "ماہرین اقتصادیات کہتے ہیں کہ کام ہی ساری دولت کی کنجی ہے، حالانکہ کام تو بے نہایت طور پر اس سے بھی بڑھ کر بہت کچھ ہے۔ کام، ساری حیات انسانی کی اساسی شرط ہے۔ اس طرح کہ ایک نقطۂ نظر سے انسان خود بھی کام ہی کا آفریدہ ہے... سچ تو یہ ہے کہ کام ہی نے بندر کو انسان بنا دیا"۔

"اب ان اوزار کی نوعیت جن سے انسان کام لیتا ہے ایسی ہے کہ خود کام کی شکل بھی متعین کرتی ہے اور اسی کا نام زیریں ڈھانچہ ہے۔ پھر یہ زیریں ڈھانچہ جیسا کچھ بھی ہے اسی کی ماہیت کے مطابق، نظام اجتماعی، ملکیت کی نوعیت، قانون حقوق، حکومت، مذہب، فلسفہ، ادب، آرٹ، اقدار اخلاق، آئیڈیالوجی اور ثقافت تشکیل پاتے ہیں، اور جو بھی شکل وہ اختیار کرتے ہیں بہر آئینہ زیریں ڈھانچے کے متناسب و متوافق ہوتی ہے بلکہ اسی کی پیداوار"۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان، اساسی طور پر آئیڈیالوجی، ثقافت اور اقدار اخلاق کے مجموعہ کے سوا بھی کچھ ہے کہ یہاں کام کی شکل اور اس کی سازی پیداوار کی تشریح کی جا رہی ہے؟

سب سے اہم ترین لیکن انتہائی حیران کن بات تو یہ ہے کہ مارکس کی تمام نجات میں سرمایہ داری عبارت ہے۔ استحصال، طبقاتی تضاد، نیز خانگی و اجتماعی حیثیت سے اہ

مارکس کا فلسفہ جو کچھ بیان کرتا ہے سراسر اس کے مغائر ہے۔ ماہر عمرانیات مارکس کی نظر میں سرمایہ داری کی اس لئے مذمت نہیں کی جاتی کہ وہ "غیر انسانی" ہے بلکہ صرف اس لئے کہ آج وہ "ناممکن" ہے۔

حسب ذیل اقتباسات کے الفاظ کے مانہ و ما علیہ پر ذرا غور کیجئے اور دیکھئے کہ انسانیت فکر، احساس ذمہ داری، اخلاقی اقدار اور بالخصوص عدل و انصاف نیز استحصال اور غلامی کے انسداد اور اشتراکیت کے تحقق جیسے اعلیٰ تر آئیڈیل کے کیسے کیسے نقش ان پر مرتسم ہیں! مثلاً "بنی نوع انسان اپنی اجتماعی زندگی کے مرحلۂ آغاز ہی سے اپنی پیدائش کی ایک ایسی ناگزیر اور پہلے سے متعین شدہ منزل میں داخل ہوتے ہیں جو ان کے ارادہ سے آزاد ہے۔"

دوسرا اقتباس —

"ان کی پیدائش میں یہ روابط دراصل نمو پذیری کے ایک مخصوص درجہ اور مادی پیدائش کی قوتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ روابط معاشرہ کے اقتصادی ڈھانچہ کی تشکیل میں اساس کا کام دیتے ہیں یعنی وہ اصل بنیاد جس پر ایک قانونی اور سیاسی زیریں ڈھانچہ تعمیر ہوتا ہے جو ایک مخصوص معاشری شعور کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔"

ایک اور اقتباس —

"مادی زندگی میں طریق پیدائش دولت ہی معاشری، سیاسی اور فکری زندگی کا تعین کرتا ہے اور یہ انسان کا شعور نہیں جو اس کے وجود کو متعین کرتا ہو بلکہ اس کے برعکس انسان کا معاشری وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے۔"

"معاشری روابط، پیدا آور طاقتوں کے ساتھ بالکلیہ مناسبت رکھتے ہیں۔ ہاتھ کی چکی سے جاگیرداری معاشرہ نشو و نما پاتا ہے اور بھاپ انجن سرمایہ دارانہ صنعتی معاشرہ کو جنم

دیتا ہے"۔

اس لحاظ سے ابزار پیدائش یعنی ہاتھ کی چکی، چرخہ، بیلچہ، ہتھوڑا اور سندان، بھاپ انجن یا صنعتی مشینیں لامحالہ طریق پیدائش کی تشکیل کرتے ہیں اور اس طریق پیدائش سے معاشرہ کا بالائی ڈھانچہ تعمیر ہوتا ہے۔ گویا زیریں ڈھانچہ ہی اپنی ناگزیر معاشی ضرورت کے تحت بعض قانونی، عمرانی اور اخلاقی اور ثقافتی اشکال اور خصوصی طبقاتی روابط کی تخلیق کرتا ہے۔ بالائی ڈھانچہ کا ایک جزو حق ملکیت بھی ہے۔

ازمنۂ قدیم میں طریق پیدائش سے مراد ہاتھ کی محنت اور انفرادی محنت تھی لہٰذا ملکیت کا بالائی ڈھانچہ اس کے عین مطابق تھا لیکن مشینوں نے طریق پیدائش کی کایا پلٹ دی اور اجتماعی طریق پیدائش رائج ہوگیا۔ اب ان حالات میں بالائی ڈھانچہ تو اجتماعی ہوگیا لیکن ملکیت ذاتی کی برقرار رہی جو صریحاً ایک تضاد کی شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ صنعتی نظام ایسے تضاد سے دوچار ہے جس میں پیدا آور زیریں ڈھانچہ تو اجتماعی بن گیا ہے لیکن بالائی ڈھانچہ میں ملکیت کا سنور رواج ہے اور فرد کی حیثیت ذاتی کی وہی قائم ہے۔ اس طرح کا غیر متجانس نظام لازماً ایک انقلاب پر منتج ہوتا ہے گویا پیدائش دولت کا زیریں ڈھانچہ ایک ایسے بالائی ڈھانچہ کی جستجو کرتا ہے جو اس کے عین مطابق ہو یعنی اجتماعی ملکیت اور اشتراکیت بجز میکانیت کے بالائی اور زیریں ڈھانچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے کچھ نہیں۔

اب اس دقیقہ سنجی اور تجزیہ کے بعد کیا اس توجیہہ کا جواز نہیں پیدا ہوتا کہ سامنے نظام ہائے اجتماعی نیز طبقاتی روابط، مذہبی و اخلاقی رواج اور فنا لطیفوں میں انحطاط کے میلان اور قانونی و عدالتی قاعدے جس کو محض ما قبل مشینی دور ہی کے نظام کا نتیجہ قرار دیا

جائے۔ یہاں تک کہ غلامی کی توجیہہ کیا ہو جاتی ہے اس لئے کہ مارکسیت کے اصل متن کی تصریحات کے پیش نظر اور اسی قاعدہ کے بموجب جو جدلیاتی مادیت کے فلسفۂ تاریخ کے ساتھ مخصوص ہے غلامی کا دستور قابل استنباط ہے یعنی غلامی کا رواج زرعی طریق پیدائش دولت ہی کے ایک خصوصی معاشری ڈھانچہ سے عبارت ہے چنانچہ جب اولین اجتماعی معاشرہ نے شکار کے بجائے زرعی طریق پیدائش دولت کو اپنایا تو نئے قوائے محرکہ کی ضرورت داعی ہوئی اور اس تاریخی ضرورت کے تحت حیوانات کو سدھا کر ان سے کام لینا پڑا۔ اور انسانوں کو بھی غلام بنا کر بھرتی کرنا پڑا۔ پس تاریخ کے ہر دور اور ہر معاشرہ میں جو بھی حالات موجود تھے وہ طریق پیدائش دولت ہی کے متناسب و متوافق ہوتے چلے گئے اور یہ طریق پیدائش خود اس وقت کے ابزار و آلات پیدائش کا معین کردہ تھا۔

مارکسیت کا یہ فلسفہ تاریخ و عمرانیات ایک ایسے ہولناک قبرستان کا منظر پیش کرتا ہے جس میں مارکس بحیثیت ماہر "اقتصادیات و عمرانیات" اس "انسان کو جو خدا ہے" خود ہی دفن کر دیتا ہے جسے بشریات کے ماہر و فلسفی نے تخلیق کیا تھا۔ اب ہم ایڈورڈ برتھ[1] کے اس مقولہ کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کے موقف میں ہیں جو خود بھی ایک معروف مارکسیت پسند ہے کہ مارکسیت اساساً پیدا آوروں ہی کا فلسفہ ہے۔

اب ایسی منطق کے سہارے جس سے انسانی تاریخ، انسانی معاشرہ اور حیات اور ثقافت نیز انسانی فکر اور نصب العین کی اس طرح توجیہہ و تحلیل ہوتی ہو۔ "اخلاق" یا "اقدار" یا "اصالت انسان" اور "جوہر انسانیت" پر بحث کیا معنی رکھتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان کی تخریب و تباہی ہوتی ہے۔ مارکس نے اگرچہ ایک ماہر عمرانیات کی حیثیت سے

---

[1] EDOUARD BERTH

انسانی تاریخ و معاشرہ کی تحلیل کرتے وقت خشک سائنٹفک نقطہ نظر نیز سواد اعظم کی مسلمہ واقعیت کو حتی المقدور نبھایا ہے لیکن یہ محل نظر ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوا ہے تاہم حقیقت قدرا و رلہٰذا تک کی محنت یا کھیتی باڑی کے دور میں ظلم اور عدل و آزادی اور غلامی پر اس کی سخن آرائی ایک بے جا رٹ یا خواب پریشان کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس نقطہ نظر سے مارکس کے پیشرو ماہرین عمرانیات ہی نہیں بلکہ سارے "خیال پرست" علمائے عمرانیات نے بھی یہی کچھ موقف اختیار کیا تھا لہٰذا یوں کہنا چاہیئے کہ انصاف پرستوں اور نجات دہندوں اور رہبروں کی پوری کی پوری جماعت جو غلامی، جاگیرداری، استعماریت اور ذاتی ملکیت کے ظالمانہ نظام حتیٰ کہ توہمات اور خرافات پر مبنی مذاہب نیز جابد ثقافتی رسم رواج کے خلاف ستیزہ کار رہی ہے وہ اساسی طور پر گویا تمام تر ایک کار عبث تھا کیونکہ وہ لوگ اپنے زمانہ کے طریق پیدائش کے جبری تقاضیات سے محض نابلد تھے بلکہ اس لحاظ سے ایک خیال خام میں مبتلا تھے اور یوٹوپیا "میں رہتے تھے۔ اگر مادی فلسفہ تاریخ یا سائنٹفک اشتراکیت سے کچھ بھی واقف ہوتے تو اپنے دور کی قانون سازی کے پس منظر نیز اجتماعی زندگی کی نوعیت اور انفرادی ملکیت کو انسانیت۔ سے منسلک لازم ہونے کے بجائے محض اقتصادی نظام کے زیریں ڈھانچہ کے ساتھ بالائی ڈھانچہ کی مطابقت کا نتیجہ خیال کرتے اور قضیاً ان کی پذیرائی کرتے پھر صبر کر کے بیٹھ جاتے کہ بالآخر مہدی موعود یعنی مشین کا ظہور ہوگا اور اجتماعی محنت کا اصول اپنے ساتھ لائے گا۔ اس کے بعد جدلیات کا ایک معجزہ رونما ہوگا اور مذہب کی بہشت موعود، حقیقت بن کر سرمایہ دارانہ صنعتی معاشرہ کی زیریں سے نمودار ہوگی انسان اس کے اندر ایک خدائے تو تم بن کر رہیں گے۔

: یوٹوپیا (UTOPIA) کے لئے شہر یعنی کی اصطلاح بھی ہے۔ (مترجم)

لیکن یہ خدائے نافع جو مشین کا ساختہ ہوگا کن قدروں کا حامل ہوگا ؟ اس کے اخلاق فضائل کیا ہوں گے ؟ لہٰذا بورژوائیت کے نظام سے پیدا شدہ اخلاقی پستیوں کا اس کے پاس کیا علاج ہوگا ؟ لیکن اخلاقی پستیوں کا بیان کیا ذکر جبکہ بالائی ڈھانچہ کے سارے ہی اخلاق کو طریق پیدائش و دولت متعین کرتا ہے ؟ پس اخلاق کی کسوٹی کیا ہوگی۔

یہ بالکل فطری امر ہے کہ لینن جو مارکسیت کا عملی طور پر شارح اور اس کے معمار کی حیثیت رکھتا ہے، مارکس کے مقابلہ میں مارکسیت کے عملی اطلاق کو زیادہ قریب سے اور بچشم خود دیکھتا ہے، وہ صوفیوں والی الٰہیات کو جسے مارکس نے بورژوائیت کے مقابلہ میں پیش کیا تھا، بالائے طاق رکھ دیتا ہے چنانچہ سرکاری طور پر یہ اعلان کرتا ہے کہ "ہمارے نزدیک اخلاقی اصول انسانی معاشرہ کے تحت ایک خارجی وجود کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہ اصول ہی سراسر جھوٹ ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ انسان اخلاق اور تاریخ کی اس مسخ شدہ صورت سے اسلام کس طرح مصالحت کر سکتا ہے!

مارکسیت آخر انسان کو اقتدار الٰہی کا حامل کیوں سمجھتی ہے اور پھر جلد ہی اس اقتدار کو اس سے سلب بھی کر لیتی ہے؟ اس کی نظروں میں یہ انسان جو اپنے تئیں خدا ہے "جدلیاتی مادیت کے فلسفۂ تاریخ کے بہتے دریا کی جبری گزرگاہ کا ایک سنگ گراں کیوں کر ہو جاتا ہے؟ عزامیات اس کو اشیائے تجارت ہی میں سے کیوں تعبیر کرتی ہے۔ جس کی شکل ابزار پیدائش کے ہاتھوں تبدیل ہوتی رہتی ہے؟ اور انجام کار انسان کو اشتراکی نظام کا ایک عنصر کیوں گردانتی ہے جو سراپا معاشرہ کی عمارت کے اس پتھر کی مانند ہے جسے پہلے سے متعین شدہ وقت اور مقام پر نصب کر دیا گیا ہو؟

پس مارکسیت کی یہ عبرتناک قلب ماہیت انسان کا وہ انجام ہے جس سے بچنے

ناممکن ہے کیونکہ جن اخلاقی اقدار یا جوہر ذات کے شرف سے وہ انسان کو متصف خیال کرتی ہے اس کی کوئی سائنٹفک یا منطقی بنیاد نہیں لہٰذا ناچار اس کی تلاش اس کو عالم طبعی و عالم مادی میں کرنی پڑتی ہے۔ عالم طبعی میں تو رائج الوقت نظریت سے اس کا سابقہ پڑتا ہے جو انسان کو حیوانات کے زمرہ میں شامل کر دیتی ہے لیکن مارکس کو اس سے شدید اختلاف ہے۔ رہا عالم مادی تو مارکس بھی مادہ ہی کو انسان کی اصل خیال کرتا ہے اور اس کی اپنی تعبیر کے مطابق اس دور کی "عامیانہ مادیت" کی پستیوں میں خود ہی گرفتار ہو جاتا ہے جو عالم کو محض جامد میکانیت کی کارفرمائی کا حاصل گردانتی ہے تاہم مارکس اس کو سرے سے رد کر دیتا ہے۔

انہی وجوہ کی بنا پر مارکس اور اس کی ہم نوائی کرتے ہوئے اینجلز بھی "عامیانہ مادیت اور کم نہاد فطرتیت" کی تنگنائے کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جدلیات کے انکشاف اور مادیت کے ساتھ اس کے اتصال ہی سے ان بدبختانہ عواقب پر قابو پایا جا سکتا ہے کیونکہ اس طرح انسان نہ صرف یہ کہ ایک "مادی شے" یا "موجودات فطرت" میں سے نری اور ساکن و ثابت ہستی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ذاتی جدوجہد کے ذریعہ اور تضادات وجدال کے ہاتھوں ایک ایسی حقیقت بن جاتا ہے جو اپنے وجود کی تکمیل خود کر رہا ہو۔

اگر ہیگل اپنی جدلیات کی برتری کا قائل ہے تو اس کا یہ ادعا کچھ وقعت بھی رکھتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک انسان کی ہستی اپنی نہائی حیثیت میں "تصور مطلق" سے ترکیب یافتہ ہے اور یہ عالم اس تصور کی ضد ہے، اسی بنا پر عالم فطرت اور مادہ کے ساتھ اپنے ارتباط کے دوران ہیگل اپنی جدلیات میں انسان ہی کو علت اولیٰ اور اشرف عنصر قرار دیتا ہے لیکن مارکس نے خود اپنے قول کے مطابق اس کو الٹ کر تصور پہ مادہ کی فوقیت جتلا دی اور پھر یہ اعلان کر دیا کہ "تصور" کا صدور مادہ ہی کی ذات سے ہوتا اور جبری انداز میں

انسان کے اندر نفوذ کرتا ہے اور اس طرح انسان کے ایک صاحب ارادہ، صاحب فکر اور آگاہی سے متصف ہونے میں اس کو ناکام ہے چنانچہ مارکس نے ہیگل کی جدلیات اور ہیگل کے انسان کے سلسلہ میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اس کی تعبیر یوں کرتا ہے کہ ہیگل کے نزدیک وہ انسان جو اپنے سر کے بل چلتا ہے اس عمل معکوس سے اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہوتا اور چلنے کے قابل ہو جاتا ہے "لیکن ایک مسلمان ادیب اس پر طنز کرتے ہوئے سوال کرتا ہے کہ "کیا انسان واقعی ایک ایسی ہستی نہیں جو اپنے سر کے بل چلتا ہو؟"

مارکس اپنی جدلیاتی مادیت کے اثبات میں یونانی فلسفی ہیراقلیطس[۱] سے استناد کرتا ہے جو کہتا ہے کہ ہر چیز تغیرات کا ایک مسلسل سلسلہ ہے اور یہ کہ "کوئی شخص بھی ایک سے زیادہ مرتبہ اسی دریا میں داخل نہیں ہو سکتا" لیکن حقیقت یہ ہے کہ مارکس جس نے ہیگل کی جدلیات کو الٹ کر رکھ دیا ہے، ہیراقلیطس سے بھی کاملاً انحراف کر بیٹھا ہے۔

ہیراقلیطس اگرچہ ہر چیز کو تغیر و تحول کا خوگر قرار دیتا ہے تاہم وہ ضمناً نہیں اور علانیہ طور پر بھی دو مستقل اصولوں کا اعتراف کرتا ہے جن میں سے ایک تو مقدس جوہر اعلیٰ ہے جسے آگ سے تعبیر کرتا ہے اور دوسرا ایک مستقل نظم و ضابطہ جس کو ایک اٹل قول[۲] کا نام دیتا ہے لہٰذا ایسی جدلیات کو مارکس کی جدلیاتی مادیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے جو بقول لینن یہ اعلان کرتی ہے کہ "وہ تنہا اصول جس کا مستقل وجود ہے صرف اصول تغیر ہے"

۱؎ : ہیراقلیطس - HERACLITUS

۲؎ : LOGOS شریعتی نے اس کا ترجمہ کرنے کی بجائے اصل لفظ LOGOS ہی استعمال کیا ہے (مترجم)

بلکہ یہ جدلیات تو مشرقی مذاہب میں تضادات پر مبنی رمزیت کے ساتھ زیادہ مشابہ اور ہم آہنگ ہے۔ بالخصوص زرتشت اور مانی کے مذاہب کے ساتھ اور یہودیت و مسیحیت اور اسلام نیز مشرقی تصوف کے ساتھ۔ اس لئے کہ عالم اور انسان کے تضادات کے باہمی تصادم ہی کی بنا پر یہ تصورات قائم ہیں۔ یعنی خیر و شر کا تضاد، اہورا مزدا اور اہرمن کا تضاد، ظلمت و روشنی کا تضاد، اور انسان و ابلیس کا تضاد۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم ان تصورات میں دو اٹل اصولوں کا وجود ہے۔ ایک، تو کائنات کی تکمیل اور دوسرا وہ ذات اقدس یا روح ابدی جو سارے عالم پر حکمران ہے۔

مارکس چونکہ ان دونوں اصولوں کا انکار کرتا ہے اور صرف ایک ہی اصول یعنی تضادات پر مبنی مطلق تغیر ہی کا قائل ہے لہذا یہ فطری امر ہے کہ وہ "انسان کی اصالت" یا "انسان کے ابدی اخلاق و اقدار" کو خاطر میں نہ لائے کیونکہ تغیرات کے اس سیل مسلسل میں کوئی چیز اپنا اصلی وجود نہیں رکھتی جس پر تکیہ کیا جا سکتا ہو۔ اسی بنا پر یہ فطری بات ہے کہ مارکس جس نے ان "اخلاقی قدروں" اور "انسانیت کے جوہر" سے "انسانیت" کی حمایت کرتے ہوئے استفادہ کیا ہے۔ مارکسیت کے معاشرہ میں ایسی مادی صفات ہوں گی جو ناقابل اعتبار اور پیہم متغیر ہوں، کیونکہ ہر نظام، پیدائش دولت کے طریقوں کے ہی تقضیات سے پروان چڑھتا اور بدلتا رہتا ہے اور کوئی اصول اپنی اصلی شکل میں برقرار نہیں رہتا اور یقینی کو یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ "ہر اخلاقی اصول محض جھوٹ ہے"۔

اسلام جو انسان کی ذات میں ابلیس کو الوہی عنصر کے تضاد کے طور پر پیش کرتا ہے یعنی وہ عنصر جس کے سوتے مادہ سے نہیں، عالم مادی سے نہیں اور معاشرہ میں پیدائش دولت کے زیریں ڈھانچے سے بھی نہیں بلکہ ان سب سے الگ اور ماورا و مافوق ایک ایسے سرچشمے

پھوٹتے ہیں۔ جو تضادات اور تغیرات سے مملو اس عالم اور معاشرہ میں ذات ابدی اور دائم وقائم ہستی کی حیثیت سے جاری وساری ہے لہٰذا اسلام مستقل اور اصلی اقدار اخلاقی اور "نیک وپاکیزہ طینت" اور "اعلیٰ وارفع سرشت" جیسے موضوعات کے بارے میں، جن سے دراصل انسان کی شخصیت کی تعمیر وتکمیل ہوتی ہے، لب کشائی کی جرأت کرسکتا ہے۔

مارکس کہتا ہے کہ انسان پیدائش ہی سے نیک نہاد ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عالم مادی میں نیکی کیا مقام رکھتی ہے؟ دوسرے یہ کہ اس سیل مسلسل وپیہم میں جہاں ہر چیز تغیر وتحول کا شکار ہے "ثبات" یا "دائم وقائم نہاد" کا ذکر جدلیات کی تعبیر کے عین مغائر ہے۔

اسلام، عالم طبیعی کے سائنٹفک تجربات ہی کے مطابق ہر چیز کو "کون وفساد" کا تابع خیال کرتا ہے اور ہر شئے کا اسی روشنی میں جائزہ لیتا ہے۔ نیز اس کا قائل ہے کہ ہر چیز اپنے اندر ارتقائی صلاحیت پنہاں رکھتی ہے گویا جو کچھ اس عالم فانی میں رونما ہوتا ہے وہ کائنات میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کل شئی ھالک الا وجہہ[1]۔ یعنی ہر شئے فنا ہو جاتی ہے بجز اس کے جو ربّ ذوالجلال کی جانب اپنا رخ پھیرے۔

انسان کی حیثیت وماہیت کا تعین کرتے ہوئے اسلام ایک بھی غیر واقعی یا غیر سائنٹفک معیار کو نہیں اپناتا۔ اسلام کے نزدیک انسان کی تخلیق بہرحال خاک یعنی مادہ ہی سے ہوتی ہے۔ البتہ اپنی نہاد میں ایک ایسی استعداد بھی رکھتا ہے جو مادہ سے بالکل الگ ہے اور جس کا نام "فطرت" ہے۔ اسلام انسان کو کائنات کے ارادۂ مطلق یعنی ذات الوہی کا پرتو خیال کرتا ہے گویا عالم طبیعی اور خدا کے مابین انسان ایک شخصیت دوگانہ کا حامل ہے۔

---

[1] قرآن مجید: سورۃ ۲۸- آیت ۸۸۔ (مترجم)

نیز اپنی ذات کے تکمیلی و ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا خود اپنے ہی اختیار کی بنا پر ہر دم و پیہم جہانِ خاک سے سوئے خداوندی کی منزل کی طرف رواں دواں ہے یہیں آکر اس کا "نیک نہاد" ہونا اور "مسئول" ہونا با معنی بن جاتا ہے۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا [1]

لہٰذا اسلام ہی کو زیب دیتا ہے کہ ایک ایسی انسیات کے بارے میں جو منطق اور صداقت پر مبنی ہو خیال آرائی کر سکے۔ اس انسیات کے بارے میں نہیں جو مادیت کے قعر میں گر چکی ہو اور نہ اس کے جو بازیچہ لاشعور کا کھلونا بن کر رہ جائے اور اختیار و ارادہ سے عاری ہو کر محض جدلیات کی اندھی مادی طاقتوں کی تابع محمل ہو۔ پھر یہ کہ اسلام کی انسیات میں کسی خالص اور مجرد مابعد الطبیعی تصور کا بھی دخل نہیں جس کے نتیجہ میں واقعیت اور عالم فطرت اور معاشرہ سے اس کا رشتہ منقطع ہو سکے۔

مارکسیت کے برخلاف اسلام ان تمام اصولوں کا دفاع کرتا ہے جو عدل و انصاف شرافت و ہدایت و مسئولیت نیز آگہی، اقدار اخلاقی و فضائل انسانی کی حیثیت سے تمام نوع انسان کی تاریخ کے ہر دور میں معروف و مستحسن رہے ہیں اور ان کی تحقیق کے لئے وہ بھاپ انجن کی ایجاد پر تکیہ نہیں کرتا۔

خلاصہ

وہ سارے نظریات اور نظام ہائے فکر، خواہ قدیم ہوں کہ جدید، جو انسان کے لئے کشش کا باعث بنتے اور اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ حسب ذیل اصناف میں سے

---

[1] قرآن مجید۔ سورۃ ۳۰۔ آیت ۳۰۔ (مترجم)

کسی ایک سے تعلق رکھتے ہیں۔

صوفیانہ مذاہب یعنی مسیحیت اور مشرقی مذاہب بالخصوص بدھ مت اور ہندو مت، مادیت اپنی گوناں گوں اشکال میں، مغرب کا لبرل نظام فکر، عدمیت[1]، وجودیت اور مارکسیت۔

بجز مارکسیت کے یہ سب کے سب نظام خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی جزئی نظام ہائے فکر کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی انسان کی زندگی کی ایک ہی جہت کو محیط ہیں۔ صرف اسلام ہی ہے جو ان میں سے ہر ایک کی مختص جہت کے بالمقابل کھڑا ہے۔ مسیحیت اور مشرقی صوفیانہ مذاہب کے ساتھ تو مذہبی محاذ پر اسلام کا مقابلہ ہے اور مادیت کے ساتھ فلسفیانہ بنیادوں پر، وجودیت سے اس کا اختلاف انسانیت اور اس کی تابعیت میں اخلاقیات کے بارے میں ہے، مغرب کے لبرل نظام فکر سے اس کا تصادم، اقتصادی و معاشرتی مسائل پر ہوتا ہے البتہ عدمیت کے مقابلہ میں اسلام اپنے آپ کو صف آرا کرنا ہی بے معنی خیال کرتا ہے کہ عدمیت میں ہر چیز کے لئے کھلی چھٹی ہے۔

لہٰذا مذکورہ صدر فہرست میں ایک مارکسیت رہ جاتی ہے جو نظام افکار کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے ان تمام پہلوؤں میں اسلام کا اصل تنازعہ بحیثیت ایک دین اور ایک امت کے، مارکسیت ہی سے ہے۔ جدید نظام ہائے فکر میں ایک اور معنی کر کے بھی مارکسیت کو یکتا وصف ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کی ہر جہت کو خواہ مادی ہو یا ذہنی و روحانی، فلسفیانہ ہو یا عملی، انفرادی ہو کہ اجتماعی،

---

[1]: عدمیت NIHILISM

شرقتی نے اصل اصطلاح یعنی نہلیسم ہی لکھی ہے (مترجم)

اقتصادی ہو یا اخلاق، اپنے مخصوص تصورِ جہاں بینی کے قالب میں ڈھال لے اور یہی دلیل ہے اس امر کی کہ مارکسیت کے پہلو میں مادیت کی یلغار بنی نوع انسان پر ہر سمت سے ٹوٹ پڑتی ہیں اور سارے تاریخی مذاہب کے منجملہ ایک۔ اسلام بھی اس طرح کا ہمہ گیر مذہب اور نظامِ حیات ہے جو خدا اور بندہ کے رشتہ کو مستحکم و باقاعدہ بنانے کی خاطر انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بدھ مت یا مسیحیت کی طرح محض تزکیۂ نفس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک فلسفی کی جہاں بینی سے لیکر فرد کے طرزِ حیات تک جتنی شکلیں ممکن ہیں ان سب میں اس کا دخل ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ متضاد فکری اساس اور متضاد تصوراتِ جہاں بینی پر انحصار کرتے ہوئے اسلام اور مارکسیت دونوں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں اور بیک وقت لوگوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں۔

مارکسیت اور اسلام دونوں ہی کسی تقسیم و تجزیہ کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اول تو ہر ایک کے مخصوص تصورِ جہاں بینی کی اساس پر اس کے تمام عناصرِ ترکیبی اور تمام پہلو باہم اس قدر مربوط ہیں (ہر چند کہ یہی پہلو ہر دو میں کاملاً ایک دوسرے کے متناقض ہیں) اگر کسی ایک عنصر یا پہلو میں کمی بیشی سامنے آنے لگے تو کل بکھر سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ کوئی بھی آئیڈیالوجی اپنے اجزا کے ساتھ اس طرح باہم پیوست ہوتی ہے گویا کہ ایک عضویۂ کل جو ایک ہی روح اور ایک ہی جوہرِ نامیہ پر مشتمل ہے۔ اب اگر کسی آئیڈیالوجی کی تحلیل اس کے اجزا میں کرنے کی کوشش کی جائے تو اس طرح کا تجزیہ ایک بے جان قالب اور جسدِ بے روح میں اس کی تحویل کر دے گا۔

چونکہ مارکسیت اور اسلام دونوں کے دونوں اپنی اپنی جگہ مکمل نظام کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں اور ہنری مارٹنیٹ کی رائے

میں "مارکسیت کے لئے اس ایک سو سالہ عرصہ کے دوران سیاسی و معاشی میدان میں وقتاً فوقتاً مساعد اور سازگار حالات پیدا ہوتے رہے لیکن اس کے باوجود اسلامی معاشروں میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی حالانکہ مشرق بعید اور لاطینی امریکہ میں صورتحال اس کے برعکس ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب خود اسلام ہے" اس لئے کہ بدھ مت اور مسیحیت کے برخلاف وہ صرف فلسفیانہ محاذ پر ہی اس کی مقاومت نہیں کرسکتا بلکہ ہر ہر جہت میں اور ہر ہر محاذ پر اپنی مستقل دعوت و تبلیغ کی قوت سے لیس ہے۔

مارکس کی انسیات کی بنیادیں چونکہ مادیت پر استوار ہیں لہٰذا اسی نقطۂ نظر سے اور اپنے منشا کی خاطر وہ انسان کو محض مشت خاک خیال کرتا ہے اور آخری نوبت پر اس کی انسیات انسان کو "شئے" بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اسلام کی انسیات کی بنیاد توحید پر قائم ہے اور گرچہ وہ سائنٹفک تحلیل" کے نقطۂ نظر سے انسان کو یقیناً خاک یعنی مادہ سے بنا ہوا خیال کرتا ہے لیکن اپنے وجودی مرحلہ میں وہ سوئے خدا پرواز کناں ہے۔ خدا جس کی ذات مطلقاً "قدر ہی قدر اور وہ بھی ماورائی قدر ہو۔

مارکسیت چونکہ اقدار کو اضافی اور معاشرہ کی ساخت کے ساتھ وابستہ خیال کرتی ہے اس کے نزدیک وہ صرف معاشی بنیادوں ہی پر قابل توجیہہ ہیں اور اس طرح ساری انسانی قدروں کو وہ مادی فائدوں کی پست سطح تک لے آتی ہے۔ اسلام انہی قدروں کو انسان کی ذات میں خدائی صفات کی جلوہ آرائی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ اقتصادیات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے عقب میں "نظام اقدار" کے وجود کا بھی قائل ہے۔ یوں "اصل" اور "آئیڈیل" کے امتیاز

(سابقہ صفحہ سے متعلق)

لے: ہنری مارٹینٹ HENRY MARTINET

کو برقرار رکھتا ہے اور چونکہ وہ انسان کی ذات میں خاک و خدا کی ثنویت کا اقرار کرتا ہے لہذا وہ اسی ذات میں "ارادہ" اور "قدر" کی ثنویت۔ نیز "اقتصاد" و "اخلاق" کی ثنویت کی توجیہہ پر بھی قادر ہے۔

بیگل جدلیات کے ساتھ مادہ کا رشتہ جوڑ کر اور مادیت کے ابزار پیدائش کے ساتھ جدلیات کو باہم پیوست کر کے مارکسیت ایک ایسی "وابستہ ابزار مادی جبریت" تک پہنچتی ہے کہ انسان کا بطور "ارادہ" وجود سرے سے برباد کر دیتی ہے اور نتیجۃً انسان کی مسئولیت کا اصل سوال کسی توجیہہ کے بغیر ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔

اسلام ایک جانب اس کا معترف ہے کہ ہر معاشرہ میں نظم و ضبط کے چند اصول اور قاعدے ہوتے ہیں، نیز انسانی تاریخ کا مسلسل ارتقائی عمل سائنٹفک کلیات و ضوابط کا پابند ہے لیکن چونکہ انسان کے ارادہ کو وہ سارے عالم وجود کے ارادہ کا مظہر گردانتا ہے اور اس کو اپنے ہی جوہر وجود سے نمو یافتہ نہ کہ پیدائش دولت یا معاشرہ کی ارادہ سے عاری مقتضیات کا حاصل ٹھہراتا ہے لہذا انسیات کو جبر مادی کے جوناک قعر میں ہرگز نہیں دھکیلتا بلکہ "ہبوط آدم" اور "تفویض" کے اصولوں کا اعلان کر کے اس "جبر طبیعی" سے بھی انسان کو رہا کرا لیتا ہے جس میں مشرق کے مذاہب گرفتار رہے ہیں۔

مارکسیت جب مذہب کی نفی کرنے پر آتی ہے تو خدا کو بھی انسان کی وجودی حقیقت کا مظہر قرار دیتی ہے اور کائنات میں خدا کی جگہ انسان کو رکھ دیتی ہے لیکن اپنی تاریخی مادیت کا اثبات جب کرنا چاہتی ہے تو وہی انسان جو خدا کی تخلیق کرتا ہے، مادی اور اقتصادی وسائل کار کی پیداوار بن جاتا ہے!

اسلام انسان کو ایک عالم توحید میں پہنچاتا ہے جس میں خدا، انسان اور عالم طبیعی، باہمی

دبا مقصد طریقہ پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک آدم۔ نوعِ انسانی کا جوہر اصلی ہے ــــ ایک جسدِ خاکی جس میں خدا نے اپنی روح پھونکی ــــ وہ مادیت و قدوسیت کے مابین اپنا وجود برقرار رکھے ہوتے ہے اور یہی نہیں بلکہ اسلام امانت خداوندی بھی اسی کے پلڑے میں بیٹھے دیتا ہے اور اس طرح انسان کی مسئولیت کے لئے مادہ سے ماوراء ایک بنیاد فراہم کرتا ہے پھر ابلیس و حوا کی داستان اور گناہ و معصیت کے تصور کے نتیجہ میں عقل و عشق کو انسان کی سرشت کا جزو لاینفک سمجھتا ہے اور اس طرح اپنے ارادہ کو جبر الٰہی سے آزاد کر لیتا ہے چنانچہ بہشت سے روئے زمین پہ ہبوط آدم اس جہانِ مکافات میں اس کی زندگی کا آغاز ہے، تاکہ وہ تضادات اور آلام و مصائب سے بھرپور اس دنیا میں اپنے آزاد ارادہ عشق و آگہی اور مسئولیت کی بدولت اس جنت کا از سرِ نو تخلیق کرے اور اپنی ہی قوت بازو سے اپنے منتہا کی صورت گری کرے[1]۔ پورے شعور اور والہانہ عشق کے ساتھ خدائے واحد کی پرستش ساری کی ساری مطلق اور اعلیٰ اقدار کی مظہر بن جاتی ہے۔ انہی اقدار کو ہر شخص اپنی اپنی بساط اور بشری حیثیت کے مطابق پروان چڑھاتا اور اپنے سارے وجود میں سمو لیتا ہے۔ وجود کی کیفیت ان اقدار کو اخلاص و بلندی سے آراستہ کر کے مداومت بخشتی ہے۔ پھر وہ کمالِ ذات و ارتقائے نوعی کی پرجوش جد و جہد میں پاکیزگی جذبات کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس طرح "فاک" یعنی اپنے وجود کی طبعی و عروضی حالت سے خود کو آزاد کر کے صرف "توحید" پر دارومدار کرتا ہے ــــ گویا توحید تصورِ جہاں بینی کے اعتبار سے اور توحید فلسفۂ اخلاق و طرزِ حیات کے معنوں میں اور توحید زندگی کی بنیادی غایات کے معنوں میں ــــ اور بالآخر اپنی منزلِ مقصود یعنی فلاح سے

---

[1] ارشاد باری کے مطابق قیامت یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ۔ یعنی وہ دن جب ہر شخص دیکھے گا کہ اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا ہے۔ آیت ۴۰ النبأ
النبا ء

ہمکنار ہو جاتا ہے۔[1]

اب ہم اس موقف میں ہیں کہ اسلام اور مارکسیت، جن متضاد نظریات کی رو سے انسان کی تصویر پیش کرنے میں حسب ذیل تقابلی فہرست کے ذریعہ ان کا خلاصہ پیش کر دیں۔

(۱) مارکسیت اس اعتبار سے کہ اس کی جہاں بینی بحیثیت مادیت پر مستحکم ہے۔ انسان کو اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حد ارتقا کے نقطۂ نظر سے مادیت کے محدود دائرہ کے باہر کوئی مقام نہیں دیتی اور لامحالہ اس کی صف بندی دوسرے موجودات عالم کے گروہ میں کر کے بے شعور و بے مقصد عالم طبیعی کی تنگنائے میں اس کو محبوس کر دیتی ہے۔

اسلام چونکہ توحید پر اپنی جہاں بینی کی بنیاد رکھتا ہے وہ اس بات پر قادر ہے کہ انسان کی ذات میں خدائی جوہر کا جواز پیش کرے اور ماورائی صفات سے اس کو متصف بھی کرے نیز اس کے ارتقا اور تکمیل ذات کی حدوں کو لامتناہی بنائے اور اس طرح ایک زندہ، بامقصد اور لامحدود کائنات میں اس کا مقام متعین کرے ——— ایسی کائنات میں جس کے حدود کی وسعتوں تک سائنس بھی رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) مارکسیت چونکہ صرف اس مادیت کو زیر بحث لاتی ہے جو کلاسیکی طبیعیات کا موضوع ہے، لہٰذا انسان کے ذاتی شکوہ اور اس کی اعلیٰ وارفع اصالت کی مارکس حقیقی ستائش کرتا ہے مادی تحلیل و تجزیہ کے دوران سب ہی اس سے واپس لے لیتا ہے۔ ایک فلسفی اور انسیات کے ماہر

---

[1] : یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز صرف توحید کے اعلان سے فرمایا اور مسلسل تین سال تک اسی ایک بات پر زور دیتے رہے کہ توحید کا اصل مقصد ہی انسان کی فلاح ہے چنانچہ ارشاد فرمایا کہ "قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" یعنی لا الہ الا اللہ کہو اور فلاح پاؤ۔

کی حیثیت سے وہ انسان کی عظمت یا تو اتنی بڑھا دیتا ہے کہ خدا کو بھی فطرتِ انسانی کا خارجی مظہر قرار دیتا ہے اور اس کی تعبیر کے مطابق انسان خدا کا خالق بن جاتا ہے لیکن ایک مادیت پسند اور ماہر عمرانیات مارکس کی آئیڈیالوجی میں اسی انسان کا شمار یکایک اشیائے تجارت میں ہونے لگتا ہے یعنی ان ابزار و آلات کار کی پیداوار جو ہاتھ کی محنت یا زراعت یا صنعت میں کام آتے ہیں۔

اسلام جو انسان کی فطرت اور عالم مادی کو ایک ہی وجود باری تعالےٰ اور شعور مطلق کی دو نشانیوں (آیات) سے تعبیر کرتا ہے لہٰذا وہ اس پر قادر ہے کہ ماحول پہ انسان کے اور انسان پہ ماحول کے دوگونہ اثر کی توجیہہ بھی کر سکے۔ نیز چونکہ اسباب و علل کے تسلسل میں انسان خود بھی ایک علت کی حیثیت رکھتا ہے، وہ عالم طبیعی اور معاشرہ میں انسان کا اصل مقام متعین کرتا اور ہر نوع کی جبریت سے اس کو رہائی دلا کر محفوظ کر دیتا ہے اور مختتم تجزیہ میں اس جنون کا بھی سدباب کر دیتا ہے جو مادیت یا تاریخیت یا معاشری عنصر کا نتیجہ ہے تا کہ "اصالت انسان" "اصالت مادہ" یا "اصالت ابزار" کا قالب نہ اختیار کرے۔

(۳) مارکسیت "مادی عینیت" کی شدت کے ساتھ وفادار ہے اور اس طرح "اقدار" کو معرضِ بحث میں لانے یا ان کو اپنے محرکات کی بنیاد بنانے کے حق سے خود ہی دست بردار ہو جاتی ہے۔

لیکن اسلام عینیت کے پس پردہ اقدار کے ایک مطلق سرچشمہ کا بھی معتقد ہے لہٰذا ان اقدار کی منطقی توجیہہ کا بھی اہل ہے۔

(۴) مارکسیت، انسان کو معاشری ماحول ہی کا ساختہ پرداختہ خیال کرتی ہے اور معاشری ماحول کو ہر دم متغیر اور تبدیل ہونے والے حالات و کیفیات کا مجموعہ اور انہی پر مشروط سمجھتی ہے وہ کسی ایسے مستقل اصول پہ جس کا نام جوہر حقیقت انسانی ہے، انحصار کرنے سے قاصر ہے

اور چونکہ خدا کا انکار کرتی ہے۔ وہ ازلی فطرت انسانی کی بھی قائل نہیں چنانچہ انسان کی ان اقدار کو جن سے اخلاق کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے خود ہی ترک کر دیتی ہے، بالآخر لینین کے اس قول پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ ہر اخلاقی اصول سراسر جھوٹ ہے۔

اسلام بہرصورت عالم طبیعی کے لئے ایک اصول تسلیم کرتا ہے جس پر سائنس کی بنیاد ہے اور انسانی فطرت کے ایک اور اصول کو بھی مانتا ہے جس پر اخلاق کی بنیادیں استوار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے نزدیک انسان کی قدریں ہر زاویہ نگاہ سے اپنی ایک اصل رکھتی ہیں جن کا خاطر خواہ ثبوت مہیا ہوتا ہے، پھر اسی کے بموجب طبیعی قوانین درست قرار پاتے ہیں حالانکہ مارکسیت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان قدروں کو معاشرہ کے رسوم و عادات و آداب ہی میں شمار کرے اور وہ مادیت و اقتصادیت اور معاشرہ کی کھائی کی نذر کر دیئے جاتے ہیں۔ اسلام کا سارا زور اس پر ہے کہ اقدار کو مادی زندگی کے شرائط اور مقتضیات و تغیرات کی جبریت سے چھٹکارا دلائے اور خالصتاً فطرت انسانی کی اساس پر ان کی توجیہہ کرے اور انہیں ذات مطلق کے پرتو قرار دے جن سے بنی نوع انسان کے قلب و ضمیر درخشندہ و تابندہ رہتے ہیں۔

(۵) مادیت کے ساتھ جدلیات کا رشتہ جوڑ کر مارکسیت عالم مادی اور تاریخ و معاشرہ کے تغیرات کی توجیہہ کرنا چاہتی ہے لیکن ایسی "مادی جبریت" کا شکار ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی اصالت ہی کو خیرباد کر بیٹھتا ہے اور خود تضادات سے مملو اندھی مادیت کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح اس تمام کوشش کا وہ "انسیات" کے نام پر ادعا کرتی رہی ہے سرے سے تج دیتی ہے پھر انسان اپنی آزادی بھی کھو دیتا اور مسئولیت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اسلام انسان کی دوہری شخصیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس تضاد کا اقرار کرتا ہے لیکن نہ تو اس کو اختیار و آزادی سے محروم کر دیتا ہے اور نہ اس کے نتیجہ میں اس کی مسئولیت سے

انکار ۔ بلکہ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ ہر دو جہتیں خود اسی تضاد سے ابھرتی اور نمو پاتی ہیں یعنی یہ کہ اسلام کی رو سے انسان کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک متضاد ہستی ہے جو "حماءٍ مسنون" اور "روحِ الٰہی" سے مرکب ہے۔ وہ سراپا ایک ارادہ ہے اور حسبِ دل خواہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا اہل ہے یعنی اس کی بشری مسئولیت اس بات کی خواہاں رہتی ہے کہ اس کی شخصیت کے آدھے حصہ کو جو پیکرِ خاکی پر مشتمل ہے بقیہ آدھے حصہ کی خدمت پہ، جو خدائی عنصر ہے، مامور کر دے تاکہ وہ پروان چڑھتا ہے اور اس طرح اس کا وجود جلا پاتا اور اس کی روح کا تزکیہ ہوتا ہے۔ یعنی اس کی شخصیت کی ثنویت تبدیل بہ توحید ہو کر "صفات و اخلاقِ ربانی" سے متصف ہو جائے۔

ہم نے دیکھا کہ مادیت کے ساتھ جدلیات کا رشتہ مادی جبریت کو جنم دیتا ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اختیارِ انسانی کی اور اس کے باعث مسئولیت کی نفی ہو جاتی ہے یعنی انسان کا اختیار تو جدلیات کا نمائندہ اور مسئولیت اختیار کی نمائندہ ہو کر رہ جاتی ہے

(۶) مارکس، ہیگل کی جدلیات کو الٹ کر تصوریت کی جگہ مادیت کو لے آتا ہے۔ نیز ہیراقلیطس کی جدلیات کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیتا ہے اس لئے کہ ہیراقلیطس باوصف اس کے کہ ہر چیز کو دائماً حرکت و تغیر کا تابع خیال کرتا ہے۔ اس تغیر میں بھی کم از کم دو مستقل اصولوں کا معتقد ہے، ایک تو آگ اور دوسرے "اَل قول" اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ بنیادی طور پر وہ سچی اور مکمل جدلیات کا آغاز ہی سے قائل ہے یعنی مارکس نے جس جدلیات کو سارے عالم میں شہرت دے رکھی ہے اس کے مقابلہ میں ہیراقلیطس کی جدلیات بدرجہا مکمل اور سچی ہے گویا مغرب میں ہیراقلیطس سے لے کر انیسویں صدی میں ہیگل تک اور مشرق میں سارے بڑے بڑے مذاہب کی جہاں بینی تک ریجن یی، زرتشت، لاؤتزے اور مانی کے

مذاہب نیز ہندو مت، بدھ مت اور تینوں ابراہیمی مذاہب یعنی یہودیت، مسیحیت اور اسلام شامل ہیں) حیات اور کائنات کی توجیہ تضاد و تغیر یعنی کون و فساد ہی پر مبنی ہے۔

ہیراقلیطس کا نظریہ خاص طور پر ایک پُراسرار حیاں بینی کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ آگ کو تو ایک مقدس اور ابدی جوہر کی علامت اور "ذاتی قول" کو اس سراپا متغیر کائنات کے مستقل نظم و ربط کی علامت قرار دیتا ہے۔ جدلیات میں ان دونوں مستقل اصولوں کے انکار سے انسان کی ذات میں ایک مستقل جہت اور عالم میں ایک دائمی نظم و ربط کی بھی نفی ہو جاتی ہے اس نقطہ نظر کا نتیجہ یہ ہے کہ مارکسیت کی "انسانیات" کو روانی نہیں بلکہ امواج کے مجموعہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ کسی سہارے کا امکان ہی نہ رہے۔

(۷) برٹنڈ کے بقول جس کا شمار لینن اور اینجلز کے ہمعصر اور معروف مارکسیت پسندوں میں ہوتا ہے "مارکسیت پیدا آور مس کا فلسفہ ہے"۔

قرآن کی تعبیر کے مطابق "اسلام" فلسفہ ہدایت "ہے

(۸) مارکسیت فرض کرتی ہے کہ "خدا کو انسان نے پیدا کیا ہے" لیکن وہ جس انسان کو اس طرح کبریائی عرش پر پہنچانا چاہتی ہے۔ وہاں کسی تخت کو موجود نہ پاکر جب یہ انسان کو متمکن کر کے چاروناچار جدلیات معکوس کی لچکدار و از کار رفتہ کمند کے ذریعہ دوبارہ عرش سے فرش پر گرا دیتی ہے اور یہاں طریق پیدائش کی شکل میں ابزار پیدائش کے حوالہ کر کے اس کو تاریخی جبریت کے ہاتھوں مجبور محض بنا کر رکھ دیتی ہے

اسلام، انسان کو مادہ سے الگ مختلف نوعیت کی مخلوق خیال کرتا ہے اور اس کا معتقد ہے کہ "خدا نے انسان کی تخلیق کی ہے"۔ پس اسلام مادیت کی جبریت سے اس کو رہائی دلاتا ہے لیکن اپنی سرگزشت کے آغاز ہی میں بہشت کے اندر گناہ کا ارتکاب اس کو ایک ایسا

با اختیار اراده بنا کر پیش کرتا ہے جو ارادۂ الٰہی اور جبر الٰہی کی بندشوں سے آزاد ہو. گویا انسان ایک ذی شعور و ذی ارادہ ہستی بن جاتا ہے اور زمین و آسمان ہر دو کی اسیری سے چھٹکارا پاکر اصل انسانیت تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے. پھر خدا اس امانت کو جس کا بار اٹھانے سے انسان کے سوا کائنات کی ہر چیز نے انکار کر دیا تھا خود ہی اس کے سپرد کر دیتا ہے اور فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ انسان کے قدموں میں سربسجود ہو جائیں — فرشتے جو موجودات عالم کی طاقتوں کی علامت ہیں — بالآخر انسان کو عالم طبیعی میں اپنی جانشینی کے اعزاز سے سرفراز فرماتا اور اس جہان خاک کی جانب کوچ کا حکم دیتا ہے تاکہ یہاں پہنچ کر خدائے فطرت کی حیثیت سے وہ عالم کی تسخیر کرے اور شعور سے آراستہ ہو کر تضادات اور مصائب و آلام سے دوچار ہوتا ہوا اپنی تقدیر آپ لکھے اور اس "خود آگہی" کے راستے خدا کی طرف مراجعت کرے!

ہم نے دیکھا کہ انسانیت کے اس فلسفہ اور انسان کے بارے میں اس انداز فکر اور مادہ پرستی کے فلسفہ کے مابین کس قدر وسیع خلیج حائل ہے.

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ایک عظیم معاصر اور اسلام شناس علامہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے:-

"اسلام اور کمیونزم دونوں انسان کے بارے میں بہت کچھ کہتے ہیں اور ہر ایک اس کو اپنی طرف بلاتا ہے لیکن کمیونزم کی کاوش یہ ہے کہ انسان خدا کے پاس سے جہان خاک پر اتر آئے اور اس کے برعکس اسلام کی دعوت اس امر پر مرکوز ہے کہ جہان خاک سے خدا کے مقام اعلیٰ تک اس کی رسائی ہو."

چنانچہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام و مارکسیت دونوں جادۂ انسانیت پر ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں سفر کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کا اثبات دوسرے

کی نفی کو مستلزم ہے۔

ہر اس شخص کے لئے جس کے خیال میں ان "جدید فاجعات" کے مقابلہ میں اسلام ہی انسان کی واحد راہ نجات ہے، ایک اور ہم عصر یعنی آندرے پیٹر[1] کا بیان جو مارکسیت سے خوب واقف ہے بڑے غور و تعمق کا محتاج ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"مارکس کا مکتب فکر دراصل ناقابلِ تقسیم ہے اور اپنے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ وہ انسان اور کائنات کو ایک ہمہ گیر و ہمہ جہتی تناظر میں دیکھتا ہے اور اس کی ابجد ہی کچھ ایسی ہے"

"پس یہ مکتب اس فکر میں ہے کہ سارے مذاہب کی اصل جگہ خود سنبھال لے اور ان سب سے شدت کے ساتھ نبرد آزما ہے۔"

یہی نتیجہ ہم اسلام کے بارے میں بھی ہر اس آئیڈیالوجی کے تعلق سے اخذ کر سکتے ہیں جو انسان اور کائنات کو اپنا موضوع بناتی ہے۔

حرفِ آخر

پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کی روشنی میں حسبِ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

یہ کہ نشاۃِ ثانیہ کے بعد سارے مفکرین اور دانشور اس تگ و دو میں رہے کہ انسیات ہی ان کی امیدوں کا سہارا ہے اور مذہب کی بجائے انسیات کے ذریعہ سے انسان کی نجات کا سامان ہو سکتا ہے چنانچہ دورِ جدید کے تقریباً تمام مکاتب فکر نے الحاد کو اپنے عقائد کا رکن رکین بنا لیا لیکن ابتدا ہی سے وہ منطقی جرح و تعدیل کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور یہ مسلک ہی موہوم ہو کر رہ گیا وہ ایک ادبی اصطلاح بن گئی جس کی حیثیت افلاطونی افکار و امثال کے

---

[1] : آندرے پیٹر۔ ANDRE PIETTER

تاریخ تو تو پامالیٔ اقدار کی حکایت کے عنوان سے بڑھ کر نہ تھی اور اپنی تمام تر ادبی نمائش اور خیال وفکر کی بلند پروازی کے باوجود عملی دنیا میں نہ تو کسی توجیہ کی خوگر ہو سکتی تھی اور نہ ہی ممکنات زمانہ سے تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت تو ان اقدار کے مجموعہ کا نام ہے جو انسان کی صفات الٰہیہ پہ مشتمل ہیں، وہ انسان کے مذہب کا ایسا ورثہ ہیں کہ اخلاقِ بشری اور ثقافت کے ذریعہ نسلاً درنسلاً منتقل ہوتا رہتا ہے لیکن ہر جدید آئیڈیالوجی، مذہب کی نفی کرتی اور اس کی توجیہہ کرنے سے عاجز رہی۔ نتیجتاً یہ مکاتب جو عینیت کے معاملہ میں خود کو قدرے اشد خیال کرتے تھے، انسانیت کے دفاع میں افلاطون سے بڑھ کر تصوریت پسند بن گئے اور ہر چند کہ خود کو انسانیت کا داعی سمجھتے رہے۔ اس کو مادیت کے واہموں کی بندش سے بھی سخت بندشوں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ انسان بے چارہ جو فلاح کی تلاش میں سرگرداں، پیہم تگ و دو میں لگا ہوا تھا اس کی منزل محض "فاجعات" بن کر رہ گئی۔ اس نے استبدادی حکمرانوں اور بردہ فروشوں کے ظلم و ستم سے فرار کی خاطر عظیم مذاہب کی گود میں پناہ لینی چاہی اور پیغمبروں کے پیچھے چلنے لگا۔ مسلسل جہاد اور قربانیوں کے مصائب برداشت کرتا رہا لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ مجوسی پیشواؤں، برہمنوں اور خلفا کے پلے پڑ گیا اور سب سے زیادہ ہولناک تو یہ کہ قرون وسطےٰ کے تاریک ترین دور کلیسا سے اس کو سابقہ پڑا جس میں آسمانی خدا کا نمائندہ بن کر پوپ روئے زمین پر ایک مطلق العنان "یہوواہ" بنا ہوا حکمرانی کرتا نظر آتا ہے جس کے ہاتھوں میں سیاست و ملکیت و عقائد کی باگ ڈور ہی نہ تھی بلکہ اہل علم و دانش بھی اس کے زیر نگیں تھے۔

اس پس منظر میں بنی نوع انسان کی صدیوں تک فلاح و نجات کی جستجو میں مسلسل جد وجہد اور ایثار و قربانیوں کے بعد نشاۃ ثانیہ شرمندۂ حقیقت بن کر منصۂ شہود پہ آتی ہے تاکہ انسانیت

کو حصول علم و حکمت اور آزادی کی نعمت سے ہمکنار کر سکے اور اس شکنجہ کو جسے اس کے سر پر مذہب کے نام سے لاد دیا گیا تھا، جھٹکا دلائے۔ چنانچہ انسانیت اب لبرل نظام حیات کو اپناتی ہے اور حکومت الٰہیہ کی جگہ جمہوری طرز حکومت کے جھنڈے تلے فلاح کی راہ تلاش کرتی ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ سرمایہ داری کے چنگل میں پھنس کر رہ گئی۔ جس میں جمہوریت بھی حکومت الٰہیہ کی طرح ایک دھوکہ ثابت ہوئی اور لبرل نظام ایک ایسا میدان کارزار بن گیا جہاں آزادی صرف شہسواروں کا حصہ بن گئی اور وہ اپنی تاخت و تاراج میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں لگ گئے اور انسانیت پھر سے اقتدار کی رسہ کشی کا شکار ہو گئی۔ سائنس، ٹکنیک حتیٰ کہ روزمرہ زندگی بھی اس مجنونانہ مدار کے گرد گھومتی رہی جہاں طالع آزماؤں اور منافع خوروں کی مسلسل اور بڑھتی ہوئی حرص و آز کا بازار گرم تھا۔

مشین کی ایجاد نے ذاتی طلب منفعت اور ربح من مزید کی دیوانہ وار کشمکش کو اس ہولناک حد تک بڑھا دیا کہ مساوات و حریت کا احساس پھر سے جب بیدار ہوا تو انسانیت اس عذاب سے فرار کی خاطر علم بغاوت بلند کرتی ہے اور کشاں کشاں کمیونزم کا رخ کرتی ہے۔ مگر یہ کمیونزم بھی قرون وسطےٰ کے کلیسا کی طرح اقتدار سے سرشار اور کچھ کم متعصب ثابت نہ ہوا۔ فرق اتنا تھا کہ یہ خدا کی ہستی سے بے نیاز ہے اور اس کے پوپ کسی "خدائے موہوم" کے نام پر نہیں بلکہ "مجہول پرولتاریت" کے نام پر بنی نوع انسان پر حکمرانی کرتے ہیں اور مطلق العنان حاکم بنے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف نبوت و امامت اور روحانیت کی پیشوائی کے دعویدار ہیں بلکہ سائنس اور عقائد اور اخلاق اور ہنر اور ادب کو بھی اپنی اجارہ داری خیال کرتے اور ان سب امور میں اپنا حکم چلاتے ہیں۔ غرضیکہ وہ کمیونزم جو بنی نوع انسان کو مذہب کی سرمایہ دارانہ استعماریت کے

ہاتھوں استحصال سے بچا کر عدل و انصاف کے نام پر مسلط ہوا تھا، بدترین استعماریت کے قالب میں ڈھل گیا۔

لیکن انسانیت کی روح کبھی مردہ نہیں ہونے پاتی۔ میری مراد وہ روح ہے جس کا قرآن ذکر کرتا ہے۔ وہ فرد کی جان اور زندگی نہیں بلکہ اس روح الٰہی کا نام ہے جو حیات بخش اور زندگی پھونکنے والی ہے۔ جس طرح زمانہ کے تن مردہ اور استخوانوں میں صور اسرافیل پھونکنے ہی ان قبرستانوں سے جہاں خموشی و موت کی حکمرانی ہے، جہاں افراد اور روح مردہ کی تدفین ہوتی ہے اور جہاں ایک عرصہ تک ان کی روح نجات و فلاح کی آرزو میں تڑپتی رہی ہے۔ وہ پھر سے جی اٹھتے ہیں۔ انسانیت کو ایک نئے جوش کے ساتھ قیامت کا سامنا ہوتا ہے اور اولاد آدم اپنی دوسری زندگی اور دوسرے دور کا آغاز کرتی ہے۔

چنانچہ اس صدی کے جسد بے جان میں یہ روح پھونکی جا چکی ہے جبکہ فلاح و نجات کی متلاشی انسانیت اپنے وجود کی آخری سرحدوں پر ہے جو مغرب کی سرمایہ داری کے تجربات کی تلخیاں سہہ چکنے کے بعد کمیونزم کے حصار کی دیواروں سے اپنا سر ٹکرا چکی ہے۔ اور اس "میخانہ" اور اس "مندر" کے درمیان ایک تیسری راہ کی جستجو میں ہے اور یہ تیسری راہ وہ ہے جس پر گامزن ہونا گویا تیسری دنیا کا منصب رسالت ہے جس کے لئے شاید وہ مبعوث ہوئی ہے۔

اس خوش آئند مستقبل اور امید افزا صورت حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار دنیا میں بھی اور کمیونسٹ دنیا میں بھی ایسی طاقتور "ارواح" ابھرتی دکھائی دیتی ہیں جو انسان کی

خود آگاہی" سے ہمکنار ہیں اور اپنی سربلندی کا مظاہرہ کرنے لگی ہیں۔ پھر سرمایہ دارمیکانی دُنیا کے شور قیامت اور ہنگامہ خیزی میں سسکتی ہوئی اور بگڑتی ہوئی انسانیت فریاد کناں ہے کہ ایک بے مقصد لبرل نظام اور جھوٹی اور پُرفریب قبائے جمہوریت تو اس کا ایک رخ ہے اور یہ کہ وہ مسخ ہوچکی ہے، دیوالیہ ہو رہی ہے، "از خود بیگانہ" ہوگئی ہے، یہاں تک کہ اس کی ماہیت کو خطرہ لاحق ہے۔

ان قوتوں کے علی الرغم، جنہوں نے معاشرہ کی ساری جہتوں کو جکڑ رکھا ہے وہی "روح" پکار پکار کر فریاد کرتی اور اس فصیل کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے سے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئی ہیں اپنی آواز بلند کرتی ہے بلکہ یہ آواز ہر روز بلند تر ہوتی جاتی ہے اور دور دور تک پہنچتی ہے تاہم مستقبل کی پیش نمائی اور اس کے لئے زمین ہموار ہونے میں ہنوز وقت درکار ہے تاکہ اس کی اصل تصویر اور خد و خال کا اندازہ ہو سکے البتہ حالات جس رُخ پر جارہے ہیں اس سمت کے بارے میں پیش بینی ممکن ہے۔

ان جدید دعوتوں میں جو بات مشترک ہے وہ اصل میں یہی ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری ہو یا مارکسیت دونوں ہی نے انسانیت کو جس راہ پر گامزن کر دیا ہے وہ تباہی کا راستہ ہے جس کو انسانیت آزما چکی ہے کہ ہر دو میں اس کی بربادی کے سامان ہیں۔ سچی انسان کی فلاح و نجات ان دونوں راستوں کو خیرباد کہنے میں ہے۔

اس منفی وجہ اشتراک کے علاوہ ایک اور مثبت وجہ اشتراک بھی ہے اور وہ یہ کہ اس ساری فریاد اور دعوت اور تلاش میں اصل جستجو اسی "روح" کی ہے۔

یہ خوش فہمی ہوگی اگر ہم اس صورت حال کو "مذہب کی جانب میلان" پر محمول کریں لیکن اتنا بخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اسے "روحانیت عالیہ" کی طلب سے موسوم کیا

جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر و بیشتر دانشور اور مفکرین نے جو دونوں متضاد یا کم از کم بظاہر متضاد معاشروں کا گہری نظر سے مطالعہ کر چکے ہیں۔ ان کے ادب سے ہر دو کی تباہ کاریوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے اور مسخ شدہ اخلاقیات پر مبنی اور ان کی فلسفیانہ اساس پر موجودہ مادہ پرستی سے نفرت کی غمازی ہوتی ہے جس نے انسان کے اعلیٰ ترین جوہر اصلی نیز اس کے ماورائی اخلاق کو سرے سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسانیت اس "ماورائی سورج" کا ماتم کرنے لگی ہے "جس نے اس کی فطرت کی گہرائیوں سے طلوع ہو کر نہ صرف اس کے وجود اور کل عرصہ حیات کو منور کر دیا بلکہ سارے عالم طبیعی کی ہر شے میں اپنی روح پھونک کر زندہ و تابندہ اور اقدار و عشق کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔"

ہائیڈگر اب انیسویں صدی کے ہیگل، یا فیورباخ کی زبان میں گفتگو نہیں کرتا اور جدید طبیعیات کا ممتاز ماہر میکس پلانک[1] تو کلاڈ برنارڈ[2] پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے۔ ہائیڈگر مسیح کی تلاش انسان میں کرتا ہے جبکہ میکس پلانک کو عالم طبیعیات میں خدا کی جستجو ہے۔

اس دور میں ادب اور آرٹ کے ماہرین بھی موجودہ انسان کی بیچارگی پر حسرت و یاس کے چار چار آنسو بہاتے ہیں۔ اس کی حیات داخلی کی مسخ شدہ کیفیت نیز اس کی تاریک اور جان لیوا تنہائی کو بڑے کرب و اضطراب سے یاد کرتے ہیں جن میں ایلیٹ[3]، اسٹرنڈبرگ[4] گنون[5] ڈاکٹر ژواگو کا مصنف پاسٹرناک[6]، ٹائن بی[7]، ایرک فرام[8]، سنیخود[9] اور غسان[10]

---

۱ میکس پلانک MAX PLANCK ۲ کلاڈ برنارڈ CLAUDE BERNARD

۳ ایلیٹ ELIOT ۴ اسٹرنڈبرگ STRIND BERG

۵ گنون GUENIN (بقیہ حوالے اگلے صفحہ پر)

اور عمر مولود[۱۱] شامل ہیں اور یہ سب کے سب کسی "نور" کی تلاش میں ہیں۔

ایک نامی گرامی معاصر اور فعلیات[۱۲] کا ماہر الیکسیس کیرل[۱۳] جس کو انسانی جسم میں رگوں کی پیوندکاری اور زندہ انسانی ریشوں کو نکال کر انسان کے بدن سے باہر بھی زندہ رکھنے کے تجربات پر دو مرتبہ نوبل[۱۴] انعام ملا ہے۔ وہ بھی خواہ غیر شعوری طور پر ہی "تائید غیبی" کا تذکرہ کرتا ہے جو اس کے خیال میں انسان کے وجود اور اس کی اخلاقی و نفسیاتی نشو و نما کو مختلف مدارج پر متوازن رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے میں زبردست عامل کا کام دیتی ہے۔

خود کمیونسٹ دنیا کے بند قلعوں کے اندر بھی جہاں مارکسیت نے کلیسائے بے خدا نے انسان کو ایک جامد ہستی بنا رکھا ہے۔ یہی "روح" جاگ اٹھی ہے اور بنی آدم کی ارست وخیز زندگی کی لہر بن کر دوڑ رہی ہے، باوجود اس کے کہ مذہب کے خلاف حکومت کے بیجا تشدد اور تعصب سے آلودہ سخت گیری کے ذریعہ جدید نسل کے ادیبوں، مفکروں اور آرٹ کے ماہروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی جان توڑ کوشش کی جاتی ہے کہ حکومت کی جدلیاتی مادیت کے ادعائی دعووں کو عملاً اور بالجبر مسلط کر دیا جائے۔ ان کو ہراساں کیا جائے اور مختلف ہتھکنڈوں سے ان کے افکار پر بھی کنٹرول کیا جائے۔ ان پر الزام یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ رجعت پسند ہیں اور مذہبی اخلاق کی تبلیغ کرتے ہیں۔

آج عالم یہ ہے کہ مارکس کے برخلاف جو انسان کی نجات کی شرط اوّل خدا کے انکار

(گزشتہ سے پیوستہ) ۵ پاسٹرناک PASTERNAK

۷ ٹائن بی TOYNBEE ۶ ایرک فرام ERIC FROMM

۹ سینغور SENGHOR ۸ اوزغان UZGHAN

۱۱ عمر مولود OMAR MAWLUD ۱۲ فعلیات PHYSIOLOGY

۱۳ الیکسیس کیرل ALEXIS CARREL ۱۴ نوبل NOBEL

کو قرار دیتا ہے اور نطشے[1] جو بزعم خود "خدا کی موت" کا اعلان کرتا ہے، سارتر جیسا الحاد پرست فلسفی بھی افسوسناک و اندوہناک طریقہ پر دنیا سے خدا کے غائب ہو جانے کا گلہ کرتا ہے اور انسان کے ہیچ در ہیچ اور اس کی ہستی کے عبث ہونے کو اسی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے آج سے تیس[2] سال قبل علی الاعلان یہ کہا تھا کہ "آج کا انسان اور کسی چیز کے مقابلہ میں صرف عالم کی روحانی توجیہہ کا محتاج ہے" اگرچہ اقبال کے قول میں یہ مضمر ہے تاہم اتنا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ "وہ انسان کی بھی روحانی توجیہہ کا محتاج ہے"۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آج ہم ایک ایسی سرحد پر کھڑے ہیں جہاں ایک عہد کی حدیں ختم ہوتی ہیں اور ایک نئے عہد کی حدیں شروع ہوتی ہیں کیونکہ وہ دور ختم ہونے کو ہے جس میں مغربی تمدن اور کمیونسٹ آئیڈیالوجی دونوں ہی انسان کو نجات دلانے میں عاجز آ چکے ہیں اور دونوں کے کارناموں کو فاجعات ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ "روح جدید" ان سے اپنا سر ٹکرا کر درماندہ و ناکام ہو چکی ہے اور ایک ایسے زمانہ کا آغاز ہے کہ وہی "روح جدید" انسان کی فلاح کی تلاش کے راستہ پر گامزن ہے تاکہ ایک نیا تجربہ کرے اور نئی جہت سے اس پر عمل کرے ——— وہ جہت جس میں انسان اپنے وجود کے گوہر آبدار کی نجات کا سامان کر سکے اور اس عالم طبیعی کے سینے زرخ دے پر نور افق پر خورشید تاباں کی طرح روشن قدوسیت کا چراغ آویزاں کرے جس کے پرتو سے انسان جو اپنے آپ سے بیگانہ ہے از سر نو اپنے پایان فطرت کا مطالعہ کر سکے، دوبارہ اپنے آپ کو پا لے اور پھر فلاح و نجات کا راستہ اس کے سامنے کھلا ہو!

---

[1] نطشے NIETZSCHE

[2] علی شریعتی کی یہ کتاب ۱۹۶۰ء کے عشرہ کی ہے اس لحاظ سے (۳۰) سال کا حساب صحیح ہے۔ (مترجم)

اس نئے دور، نئی زندگی اور نئی تحریک میں اسلام کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ اسلام اپنی خالص توحید کے ذریعہ کائنات کی عمیق روحانی توجیہہ کے پیش کرنے پر قادر ہے جو ایک جانب تو ہر لحاظ سے اشرف و اعلیٰ تر اور آئیڈیل ہے ہی، عقلی و منطقی بھی ہے۔ اس کے علاوہ تخلیق آدم کے بارے میں وہ اپنے فلسفہ کی بنیاد پر انسانیت میں ایک مستقل، آزاد و بااثر جوہر کو نشان زد کرتا ہے جو اس کرہ ارض اور کائنات کی عینیت کے مطابق اور ساتھ ہی ساتھ آئیڈیل اور امر الٰہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بالخصوص اس نقطہ نظر سے بھی صحیح ہے کہ اسلام صرف فلسفیانہ یا روحانی ضرورت کو پورا کرنے یا ایک، اخلاقی نقطۂ نگاہ پیش کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حقیقی زندگی میں توحید کی بنیاد پر جہاں بینی کے تصور اور انسان کی اصالت کا تحقق کرے اور دیگر مذاہب تصوف یا موضوعی فلسفوں کی طرح انسان کی ہستی میں دین و دنیا، عقیدہ اور عمل نیز تصور و واقعیت کی تفریق کر کے اس کی شخصیت کو دو حصوں میں نہیں بانٹ دیتا۔ یہی بات لوئی گارڈے٭ نے یوں کہی ہے کہ "اسلام دین بھی ہے اور ایک امت بھی۔"

اس مستقبل کا آغاز سرمایہ داری اور مارکسیت کو پس پشت ڈال کر ہو چکا ہے۔ وہ نہ تو پہلے سے مقدر ہے اور نہ قبل از قبل اس کی تشکیل ہوئی ہے بلکہ اس کی تعمیر ابھی ہونی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی تشکیل و تعمیر میں اسلام کا خاطر خواہ حصہ ہوگا جب اس کو خود بھی صدیوں کے جمود، خرافات و توہمات اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر کے ایک قدیم ثقافت کی بجائے نئی اور زندہ آئیڈیالوجی کی صورت میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا جائے۔ یہی اسلام کے مخلص مفکرین کا اصل فریضہ ہے۔ یہ ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ عقائد کی نشاۃ ثانیہ کے ذریعہ اسلام کو

٭ : لوئی گارڈے۔ LOUIS GARDET

رجعت پسندی اور علیحدگی پسندی کے بند گوشوں سے باہر نکال کر اعتقادات کی عصری جنگ کے میدان میں لا کھڑا کیا جائے تاکہ عصری افکار کے لئے نمونہ بن کر اسلام اس میدان کے بیچوں بیچ ایک سپہ سالار کی حیثیت میں اپنے وجود کو منوانے کے قابل ہو، ایسے وقت میں جبکہ دورِ حاضر کے انسان کی جدید روح ایک نئے جہان کی نیو ڈالنے اور ایک نئے انسان کی صورت گری میں پے بہ پے کوشاں ہے۔

یہ کوئی تخیل کی جولانی اور بلند پروازی نہیں بلکہ فریضۂ منصبی ہے اور فی نفسہٖ جس کی تائید صرف اسلام کی دعوت ہی سے نہیں ہوتی بلکہ خود قرآن کے نصِ صریح سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے سچے پیرؤوں پر یہ فریضہ وہ خود عاید کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لِلّٰہِ المشرق والمغرب۔ وکذالک جعلنٰکم امۃً وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا۔ ۱؎

یعنی مشرق و مغرب سب خدا کے لئے ہے اور تمہیں ایک اوسط گروہ بنایا گیا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہے۔

ہم نے دیکھا کہ اسلام کی دعوت ہر دوسری آئیڈیالوجی اور بالخصوص ہر اس آئیڈیالوجی سے جو بزعمِ خود صرف انسان کو اپنا موضوع بناتی ہے، کس قدر بعید اور متضاد ہے اور اس کا پیغام کس قدر گہرائی و گیرائی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے!

۱؎ : آیت ۱۴۲۔ سورۃ البقرہ

ادارہ احیائے تراث اسلامی پاکستان کی مطبوعات

THE FOUNDATION FOR THE REVIVAL OF ISLAMIC HERITAGE

ہاں دوست اسا ہی تھا
مستقبل کی تاریخ پر ایک نظر
فاطمہؑ، فاطمہؑ ہے
چہار زندانِ انسان
مسلمان عورت اور عہد حاضر کے تقاضے
بحر نجات وحدت کے انتظار میں
انسان، اسلام اور مغربی مکاتب فکر
اسلام اور وقت کے تقاضے
حق و باطل
انسان اور ایمان
تحریفات واقعہ عاشورہ
جہاد اکبر
حضرت امام زین العابدینؑ
شیعہ
تفسیر المیزان (تفسیر سورہ الحمد)
توبہ
نفس مطمئنہ
ذخیرۃ النجات (از سے منسوب کچھ واقعات)
گورباچوف کو دعوت اسلام

عرفانیات جوش (جوش کی مذہبی مجموعہ کلام)
حضرت امام حسنؑ
امام جعفر صادقؑ اور مکتب تشیع
امر بالمعروف و نہی عن المنکر
ارکان اسلام کی زمانہ حال میں توجیہات
جناب بلالؓ
جناب فضہؑ
خریعت علی ایک فکری جائزہ
حیات امام النقیؑ
عقیدۂ توحید اور منطقی شعور
معراج المومنین (زائرین و حجاج کے لئے مکمل کتاب)
ارمغان نسیم
خطبۂ حضرت فاطمہ زہرا (س)
شہنشاہ سخن (میر انیس کی رباعیات کا تجزیہ)
تحریر ذات (مجموعہ مراثی پروفیسر سردار نقوی)
میر انیس کا تجزیاتی مطالعہ
بوسنیا حکایات خونچکاں
مستقبل کی نسلوں کے نام حضرت علیؑ کا پیغام

اسلام کلکتہ میں
قرآن کی حفاظت کیوں؟
تاریخ عمل
تاریخ اعثم کوفی
توصیف اشعار مشرقی علامہ اقبال در مدح اہلبیتؑ
کاروان تجلی سادات (آگرہ و تواریخ آگرہ کی تاریخ)

زیر طبع کتب:

عدل الٰہی
جعفری تحفۃ العوام مترجم
قصص الجاحد فی القرآن
عطیف رسالت
شہادت
سندھو دیش (انتخاب ترجمہ)
مجموعہ مقالات (ڈاکٹر علی شریعتی)

اسٹاکسٹ: فون: ۶۳۶۲۹۲۴

احمد اسٹیشنرز و بک سیلرز، اسٹاکسٹ و جنرل آرڈر سپلائرز

۲۰/۱۸۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی